Meer Zaheer Abass Rustmani
Cell NO:+92 307 2128068 ! +92 308 3502081
مٹی کے خواب
افسانے
سعدیہ وسیم
T2-BHQ-719

سعدیہ وسیم

فیکٹ پبلی کیشنز

14/B علی پلازہ سیکنڈ فلور ٹیمپل روڈ لاہور فون:042 36374538

Website: www.factpublications.com

Email: factpublications@fact.com

Mitti Kay Khawb

By Saadia Wasim

کتاب : مٹی کے خواب (افسانے)

مصنفہ : سعدیہ وسیم

ایڈیٹر : وسیم شیخ

ڈیزائن : محمد ذوالفقار

قانونی مشیر : تیموری لاء ایسوسی ایٹس 13 فین روڈ لاہور، فون: 042 37323202

قیمت : پاکستان: /400 :Rs کینیڈا: 10 $:Rs

Fact Publications aims to promote creative work through book publishing
More details for our publications, Visit at:
www.factpublications.com
We welcome your feed back at:
editor@factpublications.com
Saadia.wasim@hotmail.com

بہترین کتاب کی اشاعت کیلئے رابطہ کریں:
042 36374538. 0300 9482775

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

انتساب

پیارے " ا " جان

اور

پیاری " ب " جان

کی محبت اور تربیت کے نام

" و " کی انمول رفاقت کے نام

" م "، " ر " اور " ز " جیسی انمول نعمت کے نام

پاک وطن سے عقیدت کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	مٹی	7
2	بہنیں	17
3	ٹوفا	29
4	مکتی	43
5	پکوڑے	61
6	بی ہائنڈ دی سین	71
7	ابراہیم	76
8	اوٹ	89
9	کمبل	99
10	منزل	110
11	پابہ زنجیر	123
12	جنت	138
13	خواب	149
14	پانی	159
15	انکلنک	168

مٹی ابتدا بھی ہے، مٹی ہی فنا بھی!

مٹی میں ہی بقاء ہے، جستجو ہے، مٹی سے خواب بھی

مٹی کے خواب، جاگتی آنکھوں کے خواب ہوں یا سوتی آنکھوں کے۔۔۔

یہ خواب ادھورے ہوں یا پورے۔۔۔اس بات کا ثبوت ہیں کہ مٹی زندہ ہے۔

مٹی جس میں رنگ اگتے ہیں۔ مٹی، جس میں خوشبو مہکتی ہے۔ مٹی، جس میں آگہی جنم لیتی ہے۔ مٹی، جس میں گیان پنپتا ہے۔

مٹی، جو جذبہ بھی ہے، جنون بھی۔ احساس بھی، اظہار بھی!......

کیونکہ، مٹی سنتی بھی ہے، کہتی بھی ہے

مٹی کے چپے چپے پر کہانیاں ہیں۔ اس انتظار میں کہ کوئی آئے اور انہیں پڑھ لے۔

مٹی کے خواب بھی ایسی ہی ان کہی کہانیاں ہیں، جو مٹی نے کہیں اور آپ انہیں پڑھ رہے ہیں۔

سعدیہ وسیم

مٹی

میرا ڈرائیور ابھی آتا ہی ہوگا، ابھی کچھ دیر پہلے وہ مجھے اس بنچ کی نظر کرنے کے بعد خود کہیں غائب ہوگیا ہے۔ "سگریٹ لینے گیا ہوگا!" میرے منہ سے نادانستہ نکلا۔ ایک پیک پکڑ کر ابھی آ جائے گا۔ لیکن شاید کچھ دیر کے لیے کینٹین والے سے گپ شپ میں مصروف ہو جائے۔ یہ اس کی بری عادت تھی۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑتا۔ بس یونہی ماضی کھنگالنے بیٹھ گیا ہوگا۔ چاہے اس کوشش میں اس کی انگلیاں بھی "لتھڑ" جائیں۔ مگر وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا جن میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اسے ہاتھ دھونے آتے تھے۔ وہ ہاتھ کمال بے نیازی سے دھو کر اچھی طرح خشک کر لیتا کہ اس پر میل کچیل باقی رہے نہ پانی!

"عباس کا بچہ!" میرے کسے ہوئے جبڑوں کے درمیان سے عباس گویا گالی کی شکل میں برآمد ہوا۔ مگر وہ تھا کہاں!

میں نے کچھ مایوس ہو کر لکڑی کے بوسیدہ بنچ کی پشت سے کمر لگا دی۔ شہر لاہور! میرے بچپن کا یار! ایک آہ میرے نتھنوں کے راستے نکلی اور یہ لارنس گارڈن جیسے میرے گھر کا آنگن، جس میں کھیل کود کر تھک جانے کے بعد ہم پھر سے کھیلنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ ابھی تک دور دور جا کر لوٹ آنے والے ان راستوں پر ہمارے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جس جگہ میں چند جملہ اشیائے معمول کے ساتھ براجمان ہوں، یہاں سے بائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک روز میری بائیسکل گری ہوئی تھی اور میں اپنا چھلا ہوا گھٹنہ لیے بھائی کے اس راستے سے گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

بہادر بننے کی کوشش میں ہمیشہ اپنی آہیں دبانے کی کوشش میں ہوتا اور اس سعی میں میرا منہ ہوا سے بھرے ہوئے غبارے کی طرح پھول جایا کرتا تھا۔ آنکھیں سکڑ کر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی

طرح پھد کنے لگتیں اور ناک سمت کر ننھی منی سی آتش فشاں پہاڑی میں تبدیل ہو جاتا جس میں سے نیچے کی جانب ہولے ہولے لاوا بہہ نکلتا۔ میرے ہونٹ سیپ کے جانور کی طرح اپنے ہی اندر گھستے چلے جاتے۔ میں نے ایک ترچھی نظر اپنے زخمی گھٹنے کی طرف گھمائی جس میں اب خون رس رہا تھا اور ٹانگ کے نچلے حصے کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بیٹھ گیا۔ اس بہادرانہ کوشش میں دو موٹے موٹے آنسو میری آنکھوں کے حلقوں سے بہہ نکلے۔ میں منتظر تھا مگر بڑے بھیا نہیں آئے۔

یک دم میرے دونوں گھٹنوں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ یہ درد میں ٹھنڈے ملک سے تحفے میں لایا تھا اور اب تو میں اس درد کے ساتھ گزارہ کرنے کا عادی ہوتا جا رہا ہوں مگر عباس کہاں رہ گیا۔ اس وقت وہ میرے گھٹنے دبایا کرتا تھا۔ ہاں اس کی بے نیازی مجھے کھٹکتی ضرور تھی مگر وہ لاپرواہ تو نہیں تھا۔ عباس دراصل میرا نہیں، بڑے بھائی کا ڈرائیور تھا۔ اگرچہ قریباً ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم آپس میں دوستوں کی طرح ہی بے تکلف بھی تھے مگر عزت اور کام کرنے میں اس نے کبھی مجھ میں اور بڑے بھائی میں کوئی فرق روا نہیں رکھا تھا۔ وہ روز کی طرح مجھے بڑی احتیاط سے میری وہیل چیئر سے اٹھا کر میرے منتخب شدہ بنچ پر بٹھا کر ہی رخصت ہوا تھا۔ یہ اخبار، کافی کا تھرموس اور مگ، منرل واٹر کی بوتل اور کوکینز کا ڈبہ۔ اب بھی اسی ترتیب سے بنچ پر میرے پاس دھرے ہیں جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کافی پر نظر پڑتے ہی میں نے، پتھر کا بھاری مگ، جسے دیکھ کر آج پتہ نہیں کیوں مجھے ڈھیٹ آدمی کا خیال آیا، اپنے بائیں ہاتھ میں سنبھالا اور تھرموس میں سے چند گھونٹ کافی کے انڈیل کر ہلکے ہلکے چس بھرنے لگا۔

☆☆☆

لاہور میں گرمیوں کا اخیر تھا۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی سرد جھونکا میرے جسم سے ٹکرا جاتا۔ میں نے ٹانگوں پر دھرے ہلکے کمفرٹر (Comforter) کو ہاتھ سے درست کیا اور گود میں پڑا اخبار اٹھا کر دور بنچ پر دھر دیا۔ اپنے دونوں ہاتھ کافی مگ کے جسم کے اردگرد تھما کر میں کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میری چائے کی عادت کب کافی کی لت میں تبدیل ہو گئی مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔ شاید کافی شاپ پر کام کرتے کرتے ہی میں اس مہک کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کافی شاپ ہی پہلا مقام تھا جہاں میں نے کیلگری Calgery میں کام کا آغاز کیا تھا۔ کینیڈا میں کام کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے اکثر لوگ ایسے ہی ابتداء کرتے ہیں۔

اس میں عیب والی کوئی بات نہیں تھی اور اس پہر، یہی کوئی تین بجے کے قریب، اکثر لوگ تازہ دم ہونے کی غرض سے کافی پینے کافی شاپ کا رخ کرتے۔ مجھے یاد آیا فضا میں خنکی Chill کا عنصر بڑھا نہیں اور نئے نئے چہرے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے، کافی شاپ میں بھنبھنانے لگتے اور تازہ ڈونٹس، مفنز اور شارٹ کیکس کی چمک دمک انہیں وہیں ٹھہرا لیتی۔ سگریٹ پینے والوں کے الگ کیبن میں دھواں بھر جاتا۔

یہ عباس سگریٹ لے کر ابھی تک نہیں آیا۔ میں کافی نہیں پی رہا تھا۔ گرم کافی سے نکلنے والی بھاپ میری آنکھوں کے سامنے پھیل گئی تھی۔ وہ ہوتا تو حسب معمول ہم بھی ماضی کی پٹاری کھنگال کر کوئی یاد تازہ کرنے کی کوشش کرتے۔ اگرچہ ہماری ہزار کوشش کے باوجود کوئی تازہ مہک اور چمک دمک واپس نہ لوٹتی مگر ہم اس کے چہرے پر سے کچھ گرد صاف کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے اور پھر احتیاط کے ساتھ اسے پٹاری میں بند کر دیتے۔ عباس کے پاس پندرہ سال پرانی یادیں تھیں اور اس سے بھی پرانے قصے۔ والدین کی زندگی اور آخری سفر کی باتیں میں بار بار سنتا۔ بڑے بھیا کی آخری بیماری میں اگرچہ یہیں تھا مگر اصل حق عباس ہی نے ادا کیا تھا۔ کچھ عرصہ میرے دونوں بیٹے بھی میرے ساتھ ممن آباد والی کوٹھی میں رہے مگر کسی ذمہ داری یا لگاؤ کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ عباس کا جذبہ قابل ستائش تھا مگر اس کی بے نیازی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ اچانک ہی کسی اور دنیا میں غائب ہو جاتا اور اس لمحے یوں لگ رہا تھا جیسے اس جہاں سے ہی رخصت ہو چکا ہے۔ آخر کہاں مر گیا تھا وہ!

☆☆☆

چوؤں، چیوں، چیوں۔۔۔۔۔ کی آواز سن کر میں چونکا۔ کافی کا مگ اچھل کر دور جا گرا اور آن کی آن میں تمام کافی زمین کے پیاسے خطے میں جذب ہو گئی۔ اگرچہ پاکستان میں کچھ بھی ممکن تھا مگر لارنس گارڈن میں اس طرح کھلے کتوں کی آمد و رفت کا احتمال ذرا مشکل تھا۔ کینیڈا کی طرح یہاں اینملو شیلٹر (Animal Shelter) والے تھوڑا ہی تھے جو پکڑ کر مہمان بنا لیتے۔ مگر یہ کون مجھے میزبان بنانے والا ہے۔ کوئی نرم چیز میرے ٹخنوں پر پھر گئی۔ میں نے غیر دانستہ طور پر پاؤں اوپر کر لیے۔

آئی ایا پالو جائز۔ اوہ۔ رچ اے لو ونگ للل پپ!

ایک ننھا سفید پلہ بھنبھیری لیتا ہوا آ گیا اور مردانہ نسوانی آواز والی گھمبیر الجثہ عورت کے پیچھے چھپ گیا۔ عورت نے مسکرا کر مجھے دیکھا تو میرے منہ سے نکلا، اِٹس آل رائٹ۔ اس نے بڑھ کر مگ اٹھایا اور بنچ پر دھر کر کتے کو پچکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ پیچھے کتا موٹے موٹے جاگرز کے ساتھ گویا مقابلتاً جاگنگ میں مصروف ہو گیا۔ بال کٹی عورت شلوار سوٹ میں ملبوس تھی اور اپنے مغرب زدہ ہونے کا ثبوت دینے کی کوشش میں اس پہر گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ کتے کے چھو جانے سے اچانک ناپاکی کا جو احساس جاگا تھا وہ خاتون کے بناوٹی رویے سے ہونے والی ناگواری میں تبدیل ہو گیا۔ (ایک کلچرڈ ملک کی شہریت نبھانے کے لیے میں ابھی تک ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا) مجھے زینت بیگم یاد آ رہی تھیں۔ جنہیں صرف گھر کی زینت بننے میں ہی سکون ملتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتیں جو اپنی زینت غیروں پر ظاہر کرے وہ بے سکون ہو جاتا ہے۔

چیوں چیوں کی آواز دور ہوتی گئی۔ اچانک محسوس ہوا جیسے ٹخنوں سے کوئی شے ٹکرائی ہو۔ ٹامی Tommy، میرا کتا۔ مجھے Miss کر رہا ہوگا۔ زینت بیگم کے گزر جانے کے ایک سال بعد ہی میں نے اسے پالا تھا۔ ورنہ ان کے ہوتے ہوئے تو کتے کا ذکر کرنا بھی محال ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی تنگ تھیں۔ کہاں لے آئے ہیں آپ مجھے۔ وہ کہتیں۔ پرایا دیس، پرائے لوگ، پرائے ریت اور رواج، پرائی دُنیا، پرایا دین۔ وہ کہتی جاتی، یہ تو تصویروں کا شہر ہے۔ پتلوں کی دنیا ہے۔ جانوروں کی پناہ گاہ ہے اور جانوروں جیسی حرکتیں کرنے والوں کی جنت۔ کتوں کی عزت افزائی ہو رہی ہے۔ انسان کتے بنے ہوئے ہیں۔ بڑی لادینی ہے جی۔ بڑی بے برکتی۔ آپ نے سنا نہیں جس گھر میں کتے اور تصویریں ہوں وہاں فرشتے نہیں آتے۔ میں پھولتے ہوئے چہرے کو سکیڑتا ہوا backyard میں نکل جاتا۔ آتے ہیں یا نہیں، نظر تھوڑا ہی آتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ سے زینت بیگم کی کڑوی سچائی سے چڑ سی تھی اور اب ہر روز میں دیوار سے آویزاں ان کی تصویر کو سمجھاتا کہ آپ کو نہیں معلوم کتے وفادار ہی نہیں ہمدرد بھی ہوتے ہیں۔

میں اپنی بیماری اور کمزوری کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کتے کی موجودگی کی افادیت کا بھی قائل ہو چلا تھا۔ ڈاؤن ٹاؤن کی سڑکوں پر جب کبھی ٹامی میرے آگے آگے دوڑتا تو راستہ چھوڑ کر گزرنے والوں کے چہروں پر تحسین کا تاثر دیکھ کر مجھے تسلی ہوتی۔ گھر میں بھی تھے۔ میرے بیٹے بہوئیں اور اب تو ایک پوتا اور پوتی بھی مگر ٹامی ہوتا تو کسی اپنے کا احساس میرے ساتھ ساتھ ہوتا

اوراب تو اپنے پہلو میں، میں اُس کی موجودگی کا عادی ہو چلا تھا جیسے یہاں عباس کے بغیر مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے دور دور نظر دوڑائی۔ اِکا دُکا لوگ کہیں کہیں ستا رہے تھے۔ ایک نوجوان جوڑا کسی غیر توقع مداخلت کے ڈر سے دبکا بیٹھا تھا۔ ایک مالی موٹا پائپ لیے ایک کیاری سے دوسری کی جانب جا رہا تھا اور سامنے ہی وہ چوڑی سنسان سڑک تھی جو فوارے والے گول باغیچے کے اطراف میں بانہیں پھیلائے مڑ گئی تھی۔ فوارے کی دھندلی شبیہ کے عقب میں قائداعظم لائبریری کی پرشکوہ عمارت تھی جو کسی تاج محل جیسی اداس دکھائی دے رہی تھی جیسے بنا کر بھول جانے کا شکوہ کر رہی ہو۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا، جن دنوں اس لائبریری کا آغاز ہوا تھا۔ بس اُنہی دنوں مجھ پر ملک چھوڑ دینے کا خبط سوار ہوا تھا۔ مجھے گھسٹ گھسٹ کر منزلوں پر پہنچنے والے سفر سے سخت کوفت محسوس ہوتی تھی۔ جس پر چلتے چلتے اباجی اور بڑے بھیا کے سوجے پیروں تلے آبلے پڑ گئے تھے اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میرے بچے یہ ''کشٹ'' نہیں اٹھائیں گے۔ خواہ اس کے لیے مجھے مٹ جانا پڑے۔ چاہے ان کے مستقبل کے لیے مجھے اپنا حال قربان کر دینا پڑے۔ وہ بنجر زمین پر گرنے والے بیجوں کی طرح ضائع نہیں ہوں گے۔ انہیں زرخیز زمین پر پہنچایا جائے گا اور وہ پروان چڑھیں گے، پھلیں گے، پھولیں گے۔

اس لیے آج بھی میں نے انہیں یہاں آ کر بسنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ آخر اس ملک نے انہیں دیا ہی کیا ہے جو وہ یہاں آ کر خدمت کریں۔ پھلنا پھولنا تو درکنار یہاں تو کوئی اگنے بھی نہیں دیتا۔ ایک بیزاری کی لہر میرے دماغ میں سے گزری۔ میں بڑی بھاوج کی وفات کی وجہ سے آیا تھا۔ چند روز میں میری فلائٹ تھی۔ پھر شاید ہی آنا ہو۔

☆☆☆

''بوٹا خرید و گے بابو جی!'' پتہ نہیں کب مالی آ کر میرے پاس آ موجود ہوا۔ ''ہماری نرسری میں ہیں۔ کسی کے نام لگوا دو، ثواب ہوگا۔'' ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مالی نہیں تھانیدار تھا اور میری چوری پکڑنے آیا تھا ''نہیں چاہیئے'' میں بے خیالی میں بولا۔ ''بیج خرید و گے۔'' کہا ناں نہیں چاہیے۔'' میں نے قدرے اکتاہٹ سے کہا اور وہ چلا گیا۔

مجھے یاد آیا ہمارا بیک یارڈ اور فرنٹ لان پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ سجاوٹ کی غرض سے ہم نے اصلی ہی نہیں انہیں نقلی پھولوں سے بھی سجا رکھا تھا۔ رنگ برنگے مہک دار، کچھ چمک دار!

ہاں کیا بات ہے؟ میں نے رنگ برنگے گیس غباروں کا گُچھا اپنے چہرے کے پاس سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ تیرہ چودہ برس کا ایک دبلا پتلا لڑکا، ہاتھوں میں ہوا سے بھرے ہوئے غباروں کا گُچھا اور کاندھے پر ایک میلا سا تھیلا اٹھائے میرا منہ تک رہا تھا۔ "غبارے لے لو صاحب جی!" گویا ایک اور عرضی میرے سامنے رکھ دی گئی۔ "تو کیا میں غباروں سے کھیلوں!" "نہیں جی بچوں کے لیے گھر لے جانا۔" ایک مشورہ بھی آ موجود تھا۔ کیسے بچے، کون سے بچے۔ جاؤ بیٹا ہمارے بچے غباروں سے نہیں کھیلتے۔ وہ رنگوں کے پیچھے نہیں دوڑتے۔ وہ ہوا بھری چیزوں کی خواہش نہیں کرتے۔ بچہ دو ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں پتہ نہیں کیسی طاقت تھی جس نے مجھے کمزور کر دیا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے لہجہ سنبھالتے ہوئے اسے پاس بلا لیا۔ بیٹھ جاؤ یہاں اور وہ جھجکتا ہوا میرے قریب ہی آ بیٹھا۔ غباروں کے دھاگوں کی گرہ اس نے بنچ کے بازو پر باندھ دی۔ میں نے سوچا چلو وقت گزاری کے لیے عباس کا روپ ہی دھارا جائے۔ غبارے نہیں تو وقت ہی خرید لیا جائے۔ آخر ڈالر ڈالر کا حساب کتاب رکھنے والی دُنیا سے آیا تھا۔ "ہاں بھئی! کچھ پڑھائی وڑھائی بھی کی یا نہیں؟" "پڑھائی، نہیں جی۔" اس کا نچلا ہونٹ کشتی کی طرح پھیل گیا اور عقب سے پیلے پیلے دانتوں کی قطار جھانکنے لگی۔ بلا شبہ اس کے حُلیے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ شاید کبھی سکول کی شکل بھی نہ دیکھی ہو گی۔ "گھر میں کون کون ہے۔" میں نے اگلا سوال کیا؟ باپ ہے جی، پر اس کی دونوں ٹانگیں نہیں ہیں۔ ماں ہے جی پر وہ چھوٹے بھائی کو سنبھالتی ہے۔ بہن ہے جی وہ لوگوں کے کپڑے سیتی ہے جی۔ پیسہ بھی جوڑتی ہے جی اپنی شادی کے لیے۔ میں بھی جوڑتا ہوں اس کے لیے۔" "ہونہہ! بس غبارے بیچ کر اتنے کما لیتے ہو کیا کہ جوڑ بھی سکو۔" میں نے بظاہر لاتعلقی سے دریافت کیا اور منتظر نظروں کو اِدھر اُدھر گھمانے لگا۔ "بس شام کے ٹیم صاحب جی۔" جب پارکوں میں بچے آتے ہیں۔ میرا باپ پھلا کر رکھتا ہے جی۔ دن میں، میں چاچا رحمت کی دکان پر ہاتھ بٹاتا ہوں۔ صبح سبزی خریدنے والے بہت آتے ہیں ناں جی۔" میرے چپ رہنے پر وہ بولتا گیا۔

"میرا باپ بھی شام کو غبارے بیچتا تھا۔ مگر دن کو پڑھتا تھا جی۔ مجھ جتنا ہی ہو گا۔ نویں جماعت میں تھا۔ غبارے لے کر بڑے پارک میں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک تین چار سال کا بچہ گھر سے پیسے لے کر دروازے پر کھڑا تھا۔ ابے کو دیکھ کر غبارہ لینے کے لیے دوڑا۔ مگر موڑ سے آنے والے

ریڑھے کو دیکھ کر ڈر کے مارے عین سڑک کے بیچ کھڑا ہو گیا۔ ابا چلایا مگر وہ جیسے جم گیا تھا۔ ابا نے غبارے ہوا میں اڑا دیئے اور بھاگ کر بچے کو پرے دھکیل کیا۔

ریڑھے کے پہیئے ابے کی ٹانگوں کو کچل گئے۔ چند لمحوں کے لیے میں، عباس کے انتظار سے بے نیاز ہو کر لڑکے کو تکتا رہا۔ پھر کیا ہوا۔ میں نے خاموشی کو جلد توڑنے کے لیے اگلا سوال پتھر کی طرح پھینکا۔ میں لڑکے کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔ ''پھر اس نے پڑھائی چھوڑ دی جی۔ ایک روز چاچے کی بیٹی فضیلت سے اس کی شادی ہو گئی۔ پھر باجی پیدا ہوئی۔ وہ ماں کے ساتھ جاتی۔ ماں دو تین کوٹھیوں میں صفائیاں کرتی اور کپڑے دھوتی تھی۔

میں نے باجی کو بھی ماں کا ہاتھ بٹاتے دیکھا اور سوچا کہ ایک روز بڑا ہو کر بس میں ہی کام کروں گا۔ ماں اور باجی کو کام نہیں کرنے دوں گا۔ ایک کوٹھی والی ہمدرد باجی نے میری باجی کو کپڑے سینا سکھایا اور اب وہ گھر پر سلائی کرتی ہے۔ ماں بھی اُس کا ساتھ دے دیتی ہے۔ مجھے جو کام ملے میں کرتا ہوں۔ صاحب جی، عید پر آلو چنے لگا لیتا ہوں۔ سا جو جو درزی کے آرڈرز لے کر آتا ہوں۔۔۔۔۔۔

اچھا اچھا۔۔۔۔۔۔ وہی گھسی پٹی کہانیوں جیسی کہانی چل نکلی ہے۔ پاکستان کا چپہ چپہ ایسی ہی دلسوز مجبوری اور لاچاری سے بھرپور قصوں سے بھرا پڑا ہے۔ پاکستان کو اپاہج اور معذور بنانے والے دراصل یہی لوگ ہیں جو مجبوریوں کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور اس انتظار میں کہ کوئی آئے اور ہمیں اٹھائے، تمام عمر گنوا دیتے ہیں۔ میں سوچتا ہی چلا گیا۔ لڑکا بے یقینی سے میرا منہ تکتا ہی چلا گیا۔

میں بھی تو تیرہ چودہ برس ہی کا تھا۔ جب میں نے ٹھان لی تھی کہ میں اس ڈگر پر نہیں چلوں گا۔ میرے ارادے کی پختگی نے مجھے وقت سے پہلے سنجیدہ کر دیا تھا۔ گلی کے موڑ پر اکٹھے ہو کر باتیں بنانے اور فلمی گانے گانے والے لڑکوں کی صحبت سے میں ناآشنا ہی رہا۔

میں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ اس عمر میں میرے بچوں کے لیے شکستہ حال، دقیانوسی سیڑھیاں نہیں ہوں گی وہ قالین پوش زینے یا پھر ہو سکا تو لفٹ سے اوپر اور اوپر چڑھتے چلے جائیں گے۔ یہی خواہش کی تھی نہ میں نے بھی اور پورا بھی کر کے دکھایا ہے۔ یہاں بھی محنتی تھا وہاں بھی محنت کی۔ کیا ہوا! جو ٹیکسی چلانا پڑی۔ والدین کو گھر بنا کر دیا۔ بیٹوں کے لیے جائیداد بنائی۔ چند سال قبل

ہی والدین اور بڑے بھیا کی قبریں پختہ کروائیں۔ سبھی نے سراہا۔ بس ایک زینت بیگم تھیں کہ پتہ نہیں میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ وہ قناعت پسند تھیں یا ناشکر گزار۔ بیماری میں بھی انہیں یہی سوجھتا کہ کسی نہ کسی طرح میری حوصلہ شکنی کریں۔ مقصود علی! زندگی کی ڈگر تو ایک سی ہے، خواہ کہیں بھی ہو۔ باقی سب زائد ہے۔ بناوٹ سجاوٹ۔ مجھے پتہ ہے۔ تم مجھے پرائی مٹی کے حوالے کردو گے۔"

۔۔۔۔۔۔اور میں کیا کرتا۔ ان کے والدین تو کب کے گزر چکے تھے۔ کوئی قریبی رشتہ دار پاکستان میں نہیں تھا۔ اس لیے وہیں ایک مقامی قبرستان میں انہیں سپردخاک کردیا گیا تھا۔ میری بیٹی ہر جمعے مجھے لے کر فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان جاتی ہے۔ اسے زینت بیگم نے اپنے ہی رنگ میں ڈھالا ہوا تھا۔ اسی لیے زیادہ تعلیم دلانے کی بجائے انہیں اس کا گھر آباد کرنے کی ہی فکر تھی اور یہ کام سرانجام دے کر وہ دنیا سے اپنے سدھاریں جیسے ان کے لئے زندگی کا واحد مقصد بیٹی کی شادی تھا۔

☆☆☆

"ہاں تو کب کروگے بہن کی شادی۔" میں نے لڑکے کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں جی ماں کو پتہ ہے۔" اور وہ چھوٹا بھائی ابھی تم نے جس کا ذکر کیا تھا۔۔" مجھے یاد آیا۔" اسے پڑھاؤں گا میں جی۔ وہ بڑا آدمی بنے گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنا ہی چھوٹا ہونا پڑے۔" مجھے اس کی باتوں سے باپ کی تعلیم یافتہ صحبت کی مہک آنے لگی۔" مگر ماں کہتی ہے کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ ہم سب کو حق ادا کرنا ہے۔ اپنوں کا، اپنے گھر کا صاحب جی اور اپنی مٹی کا۔ پھر پاکستان ترقی کرے گا۔" (پتہ نہیں کب کرے گا ترقی؟ میں نے طنزاً سوچا۔)

ماں کہتی ہے جی صاحب! ہم سب بوٹے ہیں۔ پاکستان کی زمین پر اگنے والے، کوئی چھاؤں والا درخت، کوئی پھلدار، کوئی باڑ، کوئی بیل، کوئی جھاڑی، کوئی گھاس پھوس، ان سبھی نے اپنا ملک سجایا ہے صاحب! ماں کہتی ہے میں پھولدار پودہ ہوں۔ مجھ میں مہک ہے۔ وہ کہتی ہے' مانی' 'تیرے آنے سے سارا گھر مہک اٹھتا ہے۔"

"ہونہہ! تو" مانی" ہے تمہارا نام!" میں نے یونہی بات بڑھائی۔ جی نہیں! ایمان ہے۔ ماں پیار سے مانی کہتی ہے۔"

"چلتا ہوں صاحب جی! آپ غبارے نہیں لیں گے۔ اس نے جوابی لہجے میں کہا۔" وہ نہیں

کوئی بات نہیں! تم یہ رکھ لو۔“ میں نے جیب کھنگال کر سو کا نوٹ برآمد کیا۔ نہیں جی اس کی ضرورت نہیں۔ وہ بنچ کے بازو سے بندھی دھاگوں کی گرہ کھول رہا تھا۔ اپنے تھیلے کو واپس کاندھے پر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

”ابا کہتا ہے پاکستان تب ترقی کرے گا جب ہم اسے کرنے دیں گے جی۔ جب ہم اپنی مدد آپ کریں گے اور دوسروں کا انتظار کرنا چھوڑ دیں گے۔ جب ہم غیرت دکھائیں گے۔ اپنی مٹی کے لیے۔ اس کا حق ادا کریں گے۔“

میں بڑی بڑی باتیں کرنے والے کم سن بڑے آدمی کو پلکیں جھپکائے بغیر تکتا رہا۔ میں تو اسے بھی انہی بے کار بچوں کی طرح خیال کر رہا تھا جو چوراہوں اور بازاروں میں بھیک مانگنے والوں کا روپ دھارے پھرتے ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے اپنا حق مانگنے کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر کھایا ہوا نوالہ گلے میں گلٹ (Guilt) کی طرح پھنس جاتا ہے۔ جسے ”نگلنے“ اور نظر سے بچانے کی خاطر پانچ، دس روپے کا سودا کرنا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں اس کی بات سن کر میرے حلق میں بھی ایک پھانس اٹک گئی تھی۔ ”اچھا ادھر آؤ۔ ایک غبارہ کتنے کا ہے۔“ پانچ روپے کا جی! اچھا یہ یہیں چھوڑ جاؤ۔ میرا مطلب ہے سب کے سب اور یہ رکھ لو۔ دھاگہ چھوڑ کر اس نے خاموشی سے سو کا نوٹ تھاما اور مجھے سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ عین اُسی مقام پر جہاں ایک روز، میں اور میری بائیسکل گرے پڑے تھے۔ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اس نے دوسرے بازو کا سہارا لیا، تھیلا کاندھے پر جمایا اور اپنی راہ پر گامزن ہو گا۔

☆☆☆

میں غباروں کو دیکھنے لگا۔ وہ ساکن تھے۔ سر تانے ہوئے بچوں کی طرح! خشک ہوا کا ایک جھونکا مجھے چھو کر گزرا۔ پژمردہ سی گھاس کے خطے پر پڑے خشک پتوں اور کچھ مرجھائے ہوئے سے پھولوں نے اڑ کر اپنی جگہ تبدیل کر لی! میں یونہی سر جھکائے بیٹھا تھا کہ عباس آ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا وہ بولا ”سر جی! وہ کینٹین والا ہے ناں۔ اس نے کبھی اس سے پہلے ذکر ہی نہیں کیا کہ اس کے والد صاحب جنگ آزادی کے گمنام سپاہی تھے۔ اپنا خون بہایا تھا انہوں نے مٹی کے لیے۔

ان کا قصہ ہی مجھے لے بیٹھا۔ میں تو جی، وہ سگریٹ لینے گیا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے جیب

میں پڑی سگریٹ کی ڈبیا کو چھوتے ہوئے مجھے بتایا اور دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا ننھا سا پودا میرے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ اور یہ جی آپ کے لیے۔ آپ ابھی گھر جا کر لان میں اپنے ہاتھوں سے اسے لگائیے۔ مالی کہہ رہا تھا بڑی مہک ہے اس کے پھولوں میں۔ آپ کی یاد تازہ رہے گی۔ وہ آپ کہہ رہے تھے ناں کہ اس بار آپ شاید لوٹ کر نہ آئیں!"۔۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جی۔۔۔۔۔۔۔

"میں نے دیکھا اس کی انگلیاں گیلی مٹی میں سنی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ بولتا جا رہا تھا مگر میرے کان بہرے ہو رہے تھے۔ دونوں گھٹنوں میں درد کی ٹیسیں ابھر آئی تھیں اور میرا کمفرٹر، اس تتلی کھال کی طرح ہر کر زمین پر آ رہا تھا، جسے میں نے شیر علی بننے کی کوشش میں اب تک اوڑھ رکھا تھا۔۔۔۔ اپنی آہ روکنے کی کوشش میں میرا چہرہ پھول رہا تھا۔۔۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔۔۔ ناک مُنی۔۔۔ ہونٹ۔۔۔ اوہ میرے خدایا! میرے منہ سے نکلا۔۔۔ مجھے لگا میری ٹانگیں سُن ہو چکی ہیں۔ میرے دھڑ کے نیچے لمبی لمبی جڑیں نکل مٹی کے اندر داخل ہو رہی ہیں۔ مجھے لگا میں ایک پودا بن گیا ہوں اور کوئی قوت مجھے کھینچتی چلی جا رہی ہے۔۔۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور آنسوؤں کی دو گرم گرم لڑیاں میری آنکھوں سے چھلک کر مٹی میں جذب ہو گئیں۔

باتیں

"کھدو نوں پرولیئے تے، لیر اں ای نکلن گیاں ناں، پت!"

ماں جی، میری نانی کی یہ بات دروازے کی دراز سے اڑ کر میرے کان پر آ بیٹھی۔ جو انہوں نے ماں کی کسی بات کے جواب میں کہی ہوگی۔ دونوں ماں بیٹیاں، صحن میں پڑی بان کی چارپائی پر سر جوڑے، نا جانے کب سے باتیں بن رہی تھیں۔ سردیوں کی دھوپ دونوں کے سر کے بالوں میں لگے تازہ تازہ تیل میں کھلی مسکرا رہی تھیں ایک پرانی سی شیشی جس میں سرسوں کا نیا تیل بھرا ہوا تھا، کسی خاموش جاسوس کی طرح چارپائی کے پائے سے لگی تمام باتیں سن رہی تھی۔ ایک بڑی سی پرات میں، ایک طرف پڑے کدوؤں کے کٹے ہوئے ٹکڑے اپنے روبرو کٹے ہوئے چھلکوں اور ڈنڈیوں سے مذاکرات میں مصروف تھے۔

میں نے دروازے پر پڑی پرانی چک کو ہاتھ سے اٹھایا اور اپنی پرانی سی سائیکل کے اگلے پہیئے کی مدد سے دروازے کے پٹ، پٹاک سے کھولتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

"ماں جی! تے پرولیا ای ناں کرو ناں کھدو نوں!" (ماں جی کھدو کو کھولا ہی نہ کریں)

مجھے خواہ مخواہ کی Fielding سوجھی۔ ابھی ماں جی نے اپنا سفید سر "کیوں" کے سوال میں اٹھایا ہی تھا کہ میں نے پنجابی میں Bowling بھی کر دی۔

"فیر بنان اچ 'بڑی' محنت کرنی پیندی اے ناں ماں جی!" (پھر بنانے میں محنت کرنی پڑتی ہے) میں نے "بڑی" کے لفظ کو لمبا کرتے ہوئے شرارتاً ماں جی کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ مسکرا دیں۔

ماں جی کے ساتھ پنجابی زبان میں بات کرنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا اور ان سے شرارت کرنے کا بالکل الگ!

"چنگا تے توں گلاں لان جوگا ہو گیا ایں، بیبیے؟" (اچھا تو تم باتیں بنانے کے قابل ہو گئے ہو)

ماں جی مجھے ہمیشہ "بیبا" کہہ کر پکارا کرتیں۔ اب میں بیبا تھا یا نہیں۔۔۔۔۔۔اس کا علم مجھے

باتیں

"کھدو نوں پرو لیئے تے، لیر اس ای نکلن گیاں ناں، پت!"

ماں جی، میری نانی کی یہ بات دروازے کی درازسے اڑ کر میرے کان پر آ بیٹھی۔ جو انہوں نے ماں کی کسی بات کے جواب میں کہی ہو گی۔ دونوں ماں بیٹیاں، صحن میں پڑی بان کی چار پائی پر سر جوڑے، نا جانے کب سے باتیں بن رہی تھیں۔ سردیوں کی دھوپ دونوں کے سر کے بالوں میں لگے تازہ تازہ تیل میں کھلی مسکرا رہی تھیں ایک پرانی سی شیشی جس میں سرسوں کا نیا تیل بھرا ہوا تھا، کسی خاموش جاسوس کی طرح چار پائی کے پائے سے لگی تمام باتیں سن رہی تھی۔ ایک بڑی سی پرات میں، ایک طرف پڑے کدوؤں کے کٹے ہوئے ٹکڑے اپنے روبرو کٹے ہوئے چھلکوں اور ڈنڈیوں سے مذاکرات میں مصروف تھے۔

میں نے دروازے پر پڑی پرانی چک کو ہاتھ سے اٹھایا اور اپنی پرانی سی سائیکل کے اگلے پہیے کی مدد سے دروازے کے پٹ، پٹاک سے کھولتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

"ماں جی! تے پرولیا ای ناں کر وناں کھدو نوں!" (ماں جی کھدو کو کھولا ہی نہ کریں)

مجھے خواہ مخواہ کی Fielding سوجھی۔ ابھی ماں جی نے اپنا سفید سر "کیوں" کے سوال میں اٹھایا ہی تھا کہ میں نے پنجابی میں Bowling بھی کر دی۔

"فیر بنان اچ 'بڑی' محنت کرنی پیندی اے ناں ماں جی!" (پھر بنانے میں محنت کرنی پڑتی ہے) میں نے "بڑی" کے لفظ کو لمبا کرتے ہوئے شرارتاً ماں جی کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ مسکرا دیں۔

ماں جی کے ساتھ پنجابی زبان میں بات کرنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا اور ان سے شرارت کرنے کا بالکل الگ!

"چنگا تے توں گلاں لان جوگا ہو گیا ایں، بیبے؟" (اچھا تو تم باتیں بنانے کے قابل ہو گئے ہو)

ماں جی مجھے ہمیشہ "بیبا" کہہ کر پکارا کرتیں۔ اب میں بیبا تھا یا نہیں ۔۔۔۔۔۔ اس کا علم مجھے

نہیں ہے، لیکن شکل سے "پپاپیا" تو دکھائی دیتا تھا۔ جس طرح کبھی کبھی فلموں میں بڑے بڑے بدمعاش بھی شکل سے شریف دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے ایک وجہ شاید یہ تھی کہ میں زیادہ تر تو ماں جی کی باتیں پپیا بن کر ہی سنا کرتا تھا۔ کیونکہ اگر بیچ میں کچھ بول دیتا تو پپیا نہ رہتا اور وہ کسی نہ کسی طرح مجھے بھگا کر دم لیتیں۔ اس طرح باقی کی تمام باتیں، میرے چنگل سے نکل جایا کرتیں۔ جس کا مجھے تہہ دل سے افسوس ہوتا۔

"کیوں تنگ کر رہا ہے ماں جی کو عاصی!" ماں نے ماں جی کو بچانے کی کوشش کی۔

"بال۔۔۔۔۔۔بال۔۔۔۔۔۔" اور گلی کے بچوں کے نعروں نے مجھے بچا لیا اور میں صحن میں گری "ست ربٹی" گیند اٹھا کر گلی میں نکل گیا۔ پھر بال واپس کرنے کے بہانے، اپنی باری لینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

ہر پندرہ بیس روز میں، ایک دو روز کا پڑاؤ اپنی اکلوتی بیٹی کے ہاں کرنا ماں جی کا معمول تھا۔ ویسے بھی دونوں ماں بیٹی کو اداسی کا دورہ پڑنے میں اتنا ہی عرصہ درکار ہوتا۔ پھر کبھی تو ماموں جی ماں کے اکلوتے بھائی، اپنے سکوٹر پر یا میں جا کر ماں جی کو رکشے پر بٹھا کر کے لے آتا۔ کبھی ان کی طبیعت ناساز ہوتی تو ماں مجھے ساتھ لے کر ماموں کے گھر چل پڑتی۔ کیونکہ نانا جی کے بعد ماں جی اکیلی ہو گئی تھیں۔

باتیں تو خیر وہاں بھی ہوتیں مگر مجھے سننے کو نہ ملتیں۔ پھر ممانی اور دونوں ماموں زاد بہنیں انہیں گھیر لیتی اور میں اپنے ہم عمر کزن کے ساتھ باہر نکل جاتا اور جب یہ محفل ہمارے ہاں جمتی تو میں بہانے بہانے سے ان کے گرد منڈلاتا رہتا جیسے گھر کے آنگن کے کوے، منڈیر نہیں چھوڑتے۔ بس پپیا بننا شرط تھی ورنہ کوئی پتھر مار کر اڑا دیتا۔

☆☆☆

کُل چار بھائیوں میں، میں سب سے چھوٹا تھا۔ ماں جی کی کمپنی حاصل کرنے کے لیے یہ عہدہ اتنا بااختیار نہ تھا۔ ابا جی حیات تھے تو میں ان کی "اوٹ" لے لیا کرتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ اخبار کی اوٹ لے کر محفل کا حصہ بنے رہتے۔

اب ماں جی میرے ساتھ نہ تو چھت پر پتنگ اڑ سکتی تھیں۔ نہ گلی میں کرکٹ کھیل سکتی تھیں۔ اور میں لڑکی نہ تھا کہ منڈیر کی بجائے، چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ جاتا اور پھر سینے پرونے کی سوئی یا سبزی کاٹنے کی چھری کی طرح زبان بھی چلاتا رہتا۔

پھر بھی، پتہ نہیں کون سی ایسی رسی تھی جو بکری کی طرح مجھے چار پائی کے پائے سے باندھ دیا کرتی اور میں حتی الوسع اپنی "میں میں" دبائے، چپ کی جوگالی کرتا ہوا چار پائی کے ساتھ لگا رہتا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دونوں کانوں کو Saftey Patrol والوں کی طرح مستعد اور چوکنا بھی رکھتا۔

ماں جی اور ماں کے پاس اتنی باتیں پتہ نہیں کہاں سے آ گئی تھیں۔ پرانی پرانی گھسی پٹی باتیں ہزار ہا بار دہرائی ہوئی باتیں۔ لیکن وہ ہر بار ان باتوں کو اسی طرح دہرا دہرا کر خوش ہوتیں، جیسے اپنے پسندیدہ لباس کو بار بار دھو کر پہنا جاتا ہے اور وہ نیا نیا لگنے لگتا ہے۔

اگر وہ دونوں چغلیاں کرتیں تو میں کب کا رسی تڑوا کر بھاگ نکلا ہوتا۔ کیونکہ بنیادی طور پر میں عورتوں کی ایسی محفلوں سے "کنی کتراتا" ہوا گزر جایا کرتا ہوں۔ مگر ان دونوں کی باتیں تو اتنی دلچسپ تھیں جیسے کلاسیک سٹوریز ہوتیں ہیں جنہیں نسلوں کی نسلیں بھی بار بار پڑھتے نہیں تھکتی ہیں اور نہ بور ہوتی ہیں۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی ابا جی بھی اپنے چشمے سمیت جسے میں عینک نہیں "حکمت کی نظر" چھیڑا کرتا تھا، بوستانِ سعدیؒ کی حکایات جیسی کوئی حکمت تلاشنے ان ہی کی طرف متوجہ رہتے اور میں بجھارتوں کے مطلب جاننے کے بہانے محفل میں شامل ہو جاتا۔

☆☆☆

باتوں کی اس ٹرین پر "جھولے" لیتا لیتا میں عادی سا ہو گیا تھا۔ اس کے ٹھہرنے کے تمام مقامات اور اس پر چڑھنے اترنے والے تمام مسافروں سے میری واقفیت سی ہو چلی تھی۔ میں انہیں دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر پھر بھی تمام سفر میں ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔

کبھی میں عظمت منزل کی سیڑھیاں چڑھتا تو کبھی لائل پور کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتا پھرتا۔ کبھی "چین حاجراں" کے ساتھ باورچی خانے میں ہوتا اور کبھی "مجید پائی" کے ساتھ بکسہ اٹھائے مہمان بن جاتا۔

کبھی آزادی سے قبل گھر کے آنگن میں ماں جی کے ساتھ چاول "چھاجتا" تو کبھی آزادی کے بعد نانا جی کے ساتھ گھر کی الاٹمنٹ کا مسئلہ نپٹا رہا ہوتا۔ میں ماں کے بچپن کے جھروکے سے جھانک کر مسکراتا بھی اور ماموں کی مرغیوں کے ساتھ غوں غوں کے شور میں ڈربے سے باہر بھی نکل آتا۔

شاید مجھے انگریزی محاورے کی طرح، دوسروں کے جوتوں میں پاؤں ڈالنے کا شوق تھا۔ ماں جی اور ماں کی باتوں میں کوئی ربط ہو نہ ہو لطف ضرور تھا۔ مجھے لگتا رفتہ رفتہ میں ان سب کی طرح سوچنے اور

محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے ڈربوں کی ہمک بھی اسی طرح آنے لگی جس طرح روٹیوں کی خوشبو!

اگر میں بھوکا تھا تو قاسم بھائی روزہ دار تھے۔ وہ سنجیدہ تو پہلے بھی تھے لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد انہوں نے سنجیدگی کو اجرک کی طرح اوڑھ لیا تھا۔ شاید بچھاتے بھی ہوں کیونکہ صبح اٹھ کر نوکری پر جانے اور گھر آ کر چند معمول کے کام نپٹا کے سو جانے کے علاوہ انہیں کوئی کام نہ تھا۔ ماں جی نے ایک جگہ ان کے رشتہ کی بات چلا رکھی تھی۔ مگر وہ ابھی راضی نہ تھے۔

باقی رہے علیم اور سلیم، دونوں پڑھائی میں اس طرح مشغول نظر آتے کہ انہیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ وہ دونوں والد صاحب اور بڑے بھائی سے بہتر مستقبل کے جنون میں پڑھائی کی ذمہ داری، بھاری کتابوں اور بوجھل چشموں کی طرح اٹھائے، گوشہ نشینی اور فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔

قاسم بھائی سے بڑے حلیم بھائی تھے۔ جو کچھ کہنے سننے کو دنیا میں باقی نہ تھے۔ اپنے بچپن کی طرح وہ چمڑے کے ایک صندوق میں دفن تھے جسے ماں نے اپنے پہلوٹھی کے بچے کی یادیں سونپ رکھی تھیں۔ کبھی کبھی جب صندوق کا منہ کھلتا تو ان کی باتیں ہونے لگتیں اور وہ اسی طرح زندہ اور صحیح سلامت ہمارے سامنے ہوتے۔

اور ہاں میں تو بھول ہی گیا۔ میں ''بقلم خود'' عاصم۔ کسی خاص...... کھاتے میں نہیں کرتے تھے۔ سب کی نظروں میں لاپرواہ اور غیر ذمہ دار تو تھا ہی جسے شاید ماں نے بگاڑ رکھا تھا۔ لیکن خودغرض، ڈھیٹ اور ضدی کے خطابات سے بھی میری عزت افزائی کر دی جاتی تو میں برا نہ مانا کرتا۔ اگر مسکرا دیتا تو ایک اور خطاب مل جاتا ''بدتمیز''!

دراصل مجھے پڑھائی میں تو تھی، سر کھپائی میں دلچسپی نہ تھی۔ میرے کندھوں پر کتابوں کا بوجھ تھا، نہ آنکھوں پر چشموں کا۔ اچھی صحت کے باوجود میں ہلکا پھلکا تھا۔ ہر وقت اُڑتا رہتا۔ کبھی گلی میں ہوں تو کبھی چھت پر۔ کبھی اندرون شہر بازاروں میں، تو کبھی شہر سے باہر سیرگاہوں میں۔ گھر سے باہر، میرے مزاج نے، توجہ کرنے والے مہربانوں کا ایک خاندان بسا رہا تھا۔ میرے دوستوں کی تعداد میرے ملنے والوں سے بھی زیادہ تھی۔ جس میں ہر عمر کے دوست شامل تھے۔ میں تو یاروں کا یار تھا۔ ان کے لیے میرے پاس وقت بھی ہوتا اور کان بھی۔ میرا مطلب ہے وہ بولتے زیادہ اور میں سنتا زیادہ۔

حالانکہ اس وقت آپ کہیں گے میں باتونی ہوں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے سننا زیادہ پسند تھا۔

اور میں ان کی باتوں سے اسی طرح محظوظ ہوتا جس طرح صبح اٹھنے والے پرندوں کی چہچہاہٹ سے۔ پھر میں Sponge کی طرح باتوں میں بھیگا بھیگا رہتا۔ بس باتوں باتوں میں، میں بی۔اے میں آ گیا تھا۔ میرے پسندیدہ مضامین انگریزی اور اردو تھے۔ زبانیں جو تھیں ۔۔۔!
ہاں کبھی کبھی کسی کو منانے کے لیے مجبور ہو جانے کی خاطر میں زیادہ بول جاتا یا پھر جب کبھی وہ باتیں زرخیز مٹی پر پڑنے والے بیجوں کی طرح اُگنے لگتیں تو میری زبان بھی چلنا شروع ہو جاتی۔ بولنے کا شوق کبھی کبھی تقریروں میں حصہ لے کر بھی پورا کر لیا کرتا۔ اس میں ماں کی حوصلہ افزائی کا ہاتھ بھی ہوتا جنہیں علم سے محبت تھی اور کبھی کبھی جاننے کی کوشش میں میں زیادہ ہی بول جاتا۔ کیونکہ سوال کرنا جاننے کی پہلی سیڑھی ہے۔ ماں کہتی۔ مگر خود کم بولتی تھی کیونکہ وہ جانتی زیادہ تھی۔

کبھی کبھی وہ کہہ اٹھتی "عاصم تیری باتیں کڑوی کڑوی کیوں لگتی ہیں۔"

"سچی سچی نہیں لگتی ماں!" میں کہتا تو وہ ہنس دیتی۔

"مگر باتوں سے کھیلنا مت، پت" وہ سمجھانے لگتی۔

"نہیں اچار بناؤں گا۔" میں شرارت کرتا۔

"باتوں سے نہیں اچار حکمت سے بنتا ہے بیٹا جی!" ابا جی بحث کا انت کر دیتے۔

"حکمت! یہ کس چڑیا کا نام ہے ابا جی!" میں تنگ کرنے لگتا۔

"میرا سر ہی کھاتا رہے گا۔ یا اپنا بھی استعمال کرے گا۔ جا اپنی عقل سے ڈھونڈ اسے۔"

وہ اپنی گنج پر بچے بالوں کو ہاتھ لگا کر کہتے۔

"ابھی ڈھونڈ کر لاتا ہوں جی۔"

اور پھر میں گلی میں نکل جاتا۔ جہاں محلے کے بچے میرے انتظار میں پہلے سے موجود ہوتے۔
میرا مسئلہ شاید یہی تھا کہ میں ایک کام کے لیے زیادہ دیر سیریس ہی نہیں رہ سکتا تھا۔
ہمارا محلہ پرانا تھا۔ وہاں کے لوگ پرانے تھے۔ محلے داری بھی پرانی تھی۔ جو رشتہ داری سے بڑھ گئی تھی۔ ماں کے خاندانی رکھ رکھاؤ اور تدریسی بیک گراؤنڈ کے باعث، کوئی نہ کوئی مہمان ہمارے ہاں بن بلائے موجود ہوتا اور پھر ماں جی کی آمد پر تو خاص طور پر اڑوس پڑوس کی لڑکیاں بالیاں ٹیوشن پڑھنے کے بہانے، آنچل میں بندھی باتیں اور بچے گھروں کے چھوٹے چھوٹے راز بستوں میں بند کیے اٹھالاتے۔
ماں جی آپا جی کے نام سے جانی جاتی تھیں، ہمیشہ دھیان رکھتیں کہ لڑکوں والا گھر، آنے والی

کسی لڑکی کے لیے بدنامی کا باعث نہ بن جائے۔ اس لیے وہ مجھے اڑانے کے لیے بہانے کا کوئی نہ کوئی پتھر اپنے ہاتھ میں رکھتیں۔ مگر میں تو کووؤں سے زیادہ چالاک تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں وہ تمام باتیں جو ماں جی یا ماں کے دوسرے کانوں سے باہر نکل جاتیں۔ وہ بھی اُچک لیا کرتا۔ مگر لڑکیوں کے معاملے میں ذرا شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اسی لیے جلد ہی ادھر ادھر ہو جاتا ------ اور میں پیا بھی تھا جو ہر بات کو امانت کی طرح سنبھال کر رکھ لیتا۔ آپا جی کی ساکھ کی طرح ------ بڑے بھائی کے صندوق میں ------

☆☆☆

دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال لاپتہ ہو گئے۔ محلہ کیا بدلا ہماری دنیا ہی تبدیل ہو گئی۔ قاسم بھائی کے اصرار پر کہ وہ بارات اس محلے سے نہیں لے کر جائیں گے۔ ہم سب ہی وہ محلہ چھوڑ آئے تھے۔
اس نئے گھر میں داخل ہونے کے لیے اب میں پھاٹک سے سائیکل دروازے پر نہیں مارتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ پرانی سائیکل جو ابا جی کی ''نشانی'' تھی مجھے ایسا کرنے سے روک دیا کرتی تھی۔
میں چوروں کی طرح دبے پاؤں اس نامانوس دہلیز پر پیر دھرتا ہوا اندر آ جاتا جہاں نہ کوئی صحن تھا، نہ چارپائی۔
ماں جی کی چارپائی کو کاندھا دیے، تین برس ہونے کو آئے تھے۔ ماں کا بستر بھی اوپر والے کمرے میں جم گیا تھا جہاں باہر جھانکتی ہوئی کھڑکی پر بھی کبھی کبھی کوئی کوا آ بیٹھتا۔ بالکل میری طرح! بس وہیں ماں کی اوڑھنی کی جھلک دکھائی دے جاتی۔
میں اپنی معمولی نوعیت کی نوکری سے جان چھڑاتے ہی گھر کا رخ کرتا۔ مگر داخل ہوتے وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کسی اور کے گھر میں گھس آیا ہوں۔ جہاں باہر تو تھے ہی اندر بھی پرائے لوگ آباد تھے۔
بڑی بھابی ٹیبل پر ڈھکا ہوا کھانا چھوڑ کر اپنے لاڈلے بیٹے سمیت کمرے میں بند ہو جاتیں اور پھر وہ دروازہ شام کو قاسم بھائی کی واپسی پر کھلتا۔ آج بھی وہ اتنی ہی نئی اور پرائی تھیں جتنی چار، ساڑھے چار سال قبل۔ بلکہ ان کے آنے کے بعد تو بھائی بھی پرائے پرائے لگنے لگے تھے۔ اپنے بیٹے کو بھی گھر کی ہوا نہ لگنے دیتیں۔ یوں وہ پوتا اور بھتیجا کم اور نواسہ اور بھانجا زیادہ بن گیا تھا۔
پچھلے سال ماموں کی اچانک وفات کے بعد، ممانی کا بوجھ بٹانے کے خیال سے ماں نے علیم و سلیم کی اکٹھی شادیاں، دونوں ماموں زاد کزنز سے کردی تھیں۔ لیکن عجیب بات ہوئی کہ وہ دونوں

ایک ساتھ گھر میں کیا آئیں، دونوں بھائی ہی گھر سے "رخصت" ہو گئے۔ اپنے آنے والے بچوں کے انتظار میں مگن وہ دونوں بچوں کی طرح آپس ہی میں باتوں کے اس کھڈ ونما گیند کے ساتھ ہی کھیلتی رہتیں جو شاید وہ اپنے جہیز میں اٹھا لائیں تھیں۔

گھریلو حالات اور معمولات کے متعلق چند رسمی باتوں کے علاوہ گھر میں کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔ کبھی کبھی تو کھسر پھسر کے دھیمے دھیمے سروں کو سن سن کر یوں گمان ہوتا جیسے وہ مکان بھوت پریت کی آماجگاہ بن چکا ہے۔

ماں نے ماں جی (نانی) کے بعد سے کان تو بند کر ہی لیے تھے، اب وہ گلی میں کسی سکوٹر کی آمد پر نہ چونکتی مگر کھِدو پر ولنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ چپ رہتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کھِدو کی تمام لیریں نکال کر کہیں پھینک دی تھیں اور کھِدو کا وجود ہی باقی نہ رہا تھا۔ یا پھر خاموشی کے غلاف سے ہمیشہ کے لیے کھدو کا منہ کس دیا تھا شاید!

کھدو کے چہرے پر اگر کچھ باقی تھا تو وہ تھی مسکراہٹ!

جس میں نہ کوئی گلہ تھا نہ شکوہ بلکہ ماں کی مسکراہٹ جیسا صبر ہی صبر تھا۔۔۔۔۔۔ شکر ہی شکر وہ مسکراہٹ جو پھولوں کی طرح ہلکی تھی۔

پہلے پہل تو میں نے گھر کی بھائیں بھائیں دور کرنے کے لیے کائیں کائیں کرنے کا مشغلہ اپنا لیا۔ مگر جب میں پرائیوں کو اپنا نہ بنا سکا تو چپ سادھ کر اہل کرم کا تماشہ دیکھنے پر اکتفا کرنے لگا۔

کسی پر میرا بس تھوڑا ہی چلتا تھا۔ بس ماں پر، جیسے کبھی کچھ کہتا تو وہ کہہ دیتی "عاصم پت تو بہت اچھا سمجھاتا ہے۔ پر مجھے کیوں سمجھا رہا ہے۔ خود سمجھ جا!"

اور میں ماں سے ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے بغل کے سٹور نما کمرے میں جس میں میرے استعمال کی چند چیزیں جمع تھیں، بالکل اسی طرح لاپتہ ہو جایا کرتا جیسے بچپن میں ماں کے پلو سے چہرہ ڈھانک کر اسی کی بغل میں چھپنے کی کوشش کرتا۔

کمرے میں بستر پر لیٹ کر میں خوامخواہ کتابوں کے اوراق الٹ پلٹ کرتا رہتا مگر آنکھوں کے سامنے لکھے ہوئے الفاظ اور ہوتے اور سر میں گونجنے والی آوازوں کا شور اور۔

ایک روز بچپن میں میں نے ماں سے ایسے ہی شور کی شکایت کی تو وہ بولی: "عاصی پت تو سوچتا جو زیادہ ہے۔" واقعی میں، بس سوچتا ہی رہ جاتا اور کرتے کرتے رہ جایا کرتا تھا خاص طور پر ایسا

کام جو کچھ کرنے کی سند ہوتا۔ سو میں کتابوں کو بستر پر پٹخ کر قریبی باغ میں جا بیٹھتا۔ جہاں میں گھاس کے سوکھے تنکے اکھیڑ اکھیڑ کر اِدھر سے اُدھر ڈھیر کرتا رہتا۔

جب غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو سب کچھ بھلا کر اسی گھر کا رخ کرتا۔ جہاں اور کوئی نہ بھی ہوتا۔ ماں تو تھی۔

بس اسی طرح ایک روز میں اچھی خاصی ملازمت کو خیر باد کہہ کر واپس لوٹ آیا تھا۔ جہاں ماں نے مجھے طعنوں سے بچانے کے لیے "کچھ کرنے" بھیج دیا تھا اور پھر خود دل پر کتنا بڑا پتھر رکھ لیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا جب بڑے بھائی کے صندوق میں، میں نے اپنے لکھے ہوئے خطوں کا ڈھیر دیکھا جو میں ہر ہفتے ماں کو خوش رکھنے کے لیے لکھتا تھا۔"

آج بھی میں اس سال کی محرومی بھلا نہیں سکا جو میں نے ماں کے بغیر گزار دیا۔ سنا ہے، اعلیٰ ڈگریوں اور عہدوں کی خاطر اپنوں سے دور رہنے والے کے لبوں پر آخری وقت میں "کاش" کا لفظ کسی Unachieved Achievement کے لیے نہیں۔ بلکہ اس "وقت" کے لیے آتا ہے جو اس نے اپنوں کے ساتھ نہیں گزارہ ہوتا۔

ماں بیمار ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں کا مشورہ اتنا ہی تھا کہ اسے خوش رکھا جائے تاکہ اس کی زندگی کے دن بڑھ جائیں اور ظاہر ہے کہ میں اسے خوش ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر میں بیٹی نہ تھا کہ اس ناخوش ماں کے سوکھے آنسوؤں کو اپنے آنچل سے پونچھ دیتا جو اس کی آنکھوں کے نکڑوں میں لکیر کی طرح جم جاتے تھے۔

لیکن شاید اگر میں بیٹی ہوتا تو ابھی تک کسی پرائے گھر کی خادمہ بن چکا ہوتا۔ کیا ہوا جو میں بیٹی نہ تھا۔ میں بیٹا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ماں کے آنسو ہی بہنے نہیں دوں گا۔

پھر ایک روز باغ میں بیٹھے بیٹھے میں نے ایک کھدو بنایا۔ ست رنگی گیند جیسا کھدو۔ جس میں میں نے رنگ برنگی بولیاں لپیٹ لیں، ایسے ہی جیسے میں پنے پر ڈور لپیٹ لیتا تھا۔

اس کھدو سے پرندوں کی، چہچہاہٹ جیسی آواز آتی اور ماں جی کے کپڑوں کی سی خوشبو!

میں نے وہ کھدو ماں کے ہاتھوں میں تھما دیا تو وہ مسکرانے لگی۔ حالانکہ پرانے وقتوں میں ایسی گیندیں، مائیں اپنے بچوں کو بنا کر دیا کرتیں۔ جس میں شاید وہ اپنے کپڑوں اور آنچلوں کی کترنیں لپیٹ دیا کرتی تھیں اور شاید آنسو بھی۔۔۔۔۔۔!

اور خود میں نے گیندوں سے کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ میری فکر کرتی تو میں اس کا دھیان دوسری

طرف لے جاتا۔

زندگی تو نہیں ماں کی بیماری ہی بڑھتی گئی۔ ماں سوکھے پیڑ کی طرح آنگن کی دیوار کے سہارے کھڑی تھی اور وہ سہارا تھا میں!

میرا بس چلتا تو اپنی زندگی ماں کو تحفے میں دے دیتا۔ اپنے لہو سے اس کے پژمردہ جسم کو ہرا کر دیتا۔ مگر میں کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ بس چھوٹے بڑے کاموں میں بیٹیوں کی طرح جت گیا۔

گھر کے باقی افراد سٹیشن کے مسافر خانے میں بیٹھے مسافروں کی طرح، اس اگلے جہاں کے مسافر سے خوش خلقی کے چند مظاہروں پر اکتفا کر لیتے اور کچھ ضروری کام پڑوس میں رہنے والی خالہ جی انجام دے دیا کرتیں۔

پھر سونے سے پہلے میں ماں کے سرہانے بیٹھ کر لوری جیسی کہانیاں سنتا۔

'اچھی بات' اگر میراث تھی تو وہ میں نے پالی تھی۔ ''نیکی'' اگر 'توفیق' تھی تو میرے ہاتھ آ گئی تھی۔ یہ تو ماں کے ہی پڑھائے ہوئے سبق تھے۔ پھر صرف مجھے ہی یاد کیوں رہے، میں وقف ہو گیا۔ رات کو ماں کے سو جانے کے بعد میں وہیں کہیں پڑا رہتا۔ ماں کے بستر سے لگ کر یوں ساری تھکان دور ہو جاتی اور میں تازہ دم ہو کر صبح نوکری پر چلا جاتا۔

زندگی تو نہیں، ماں کی بیماری ہی بڑھتی گئی.

''آدمی، آدمی دا دارو اے ہُت۔'' (انسان ہی انسان کی دوا ہے)

ماں جی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ماں کی دواؤں کی تمام شیشیاں ماں کے سرہانے کی میز پر شرمسار کھڑی تھیں۔ ان کے جسموں میں بھرا ''دارو'' ماں کو زندگی بخشنے میں ناکام رہا تھا۔ شاید ماں کو ایسی دوا کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دوا کی کسی شیشی میں 'امرت' نہیں ہوتا۔ نہ شافی کے حکم کے بغیر شفا ممکن تھی۔

اس رات ماں کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں میں نے اپنا دھندلاتا ہوا عکس دیکھ لیا تھا۔ اس رات وہ جلد سو گئی اور پھر صبح نہ اٹھی۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تب بھی موجود تھی۔ مرجھائی سی مسکراہٹ، بالکل موتیے کے سوکھے پھولوں جیسی مسکراہٹ جو اس کے سرہانے پڑے سوگ منا رہے تھے۔ ماں ایک بہادر عورت تھی۔ وہ موت سے بھی نہ گھبرائی تھی۔

میری نوکری تو کب کی باقی نہ رہی تھی مگر میں نوکری ہی کا بہانہ کر کے گھر سے کچھ دیر کے لیے باہر نکل جاتا کہ ماں منتظر نہ ہو۔ پھر لوٹتے ہوئے اکثر ہاتھ میں موتیے کے پھولوں کی لڑیاں اٹھا لاتا۔ ماں کے لیے۔

میں ماں کے بستر پر بیٹھا نہ جانے کتنی دیر آنسو بہاتا رہا۔ رومال نکالنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کوئی گول شے میری انگلیوں سے ٹکرا گئی۔ وہ ایک پرانا کھدو تھا۔ جسے پہلی بار میں نے بھائی کے صندوق میں اور آخری بار ماں کے بستر پر پڑا دیکھا تھا۔ کھدو میں ہلکی ہلکی گرمی تھی۔

☆☆☆

شام ڈھل چکی ہے۔ سارے پنچھی شور مچانے کے بعد اپنے اپنے گھونسلوں میں چپ سادھے پڑے ہیں۔ آسمان کو کالی گھٹا نے گھیر لیا ہے۔ لگتا ہے خوب برسے گی۔ کبھی کبھی بجلی کوند کر اندھیرے کی سیاہ دیوار میں چمک دار دراڑیں ڈال دیتی ہے۔

آج ایک عرصے کے بعد میں یہاں آیا ہوں۔ لگتا ہے پورے قبرستان میں اس وقت میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ گورکن بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ سوچ رہا ہوں اگر آئے تو چند پھولوں کا بندوبست ہو جائے۔

آج پھر میں پھول لانا بھول گیا ہوں۔ اس دن بھی وہ گورکن جو پانی کی بالٹی اٹھائے میرے پیچھے پیچھے یہاں تک آ گیا تھا، میرے ہاتھوں میں کاغذ دیکھ کر بولا:

''کاغذ چڑھاؤ گے بیٹا!''

وہ کاغذ جو میرے ہاتھوں میں خط کی طرح تہہ شدہ تھے دراصل میرا پہلا افسانہ تھے۔ ایک کہانی جو میں ماں کو سنانے آیا تھا۔ ماں کے رائٹنگ پیڈ پر لکھ کر۔

گورکن کی بات سن کر میں نے جیب میں ہاتھ گھسایا تو چند باسی پھول میرے ساتھ لگے۔ موتیے کے پھول یونہی راہ چلتے میں توڑ کر جیب میں ڈال لیا کرتا ہوں۔

پھول نکال کر میں نے قبر پر رکھ دیے تو اچانک مولوی صاحب کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''قبر پر پھول چڑھانا بدعت ہے۔'' مگر میرے پھول تو میری خاموش باتیں تھیں جو میں ماں پر نچھاور کیا کرتا تھا۔ میری محبت تو ایک سچائی تھی۔ دکھاوا نہ تھا۔

جیسے وہ افسانہ جس میں پرندوں کی سچی بولیاں بند تھیں۔

ماں کو یاد کرتے کرتے اسی باغ میں ایک روز مجھے یوں لگا تھا جیسے تمام بولیاں کردار بن کر میرے اردگرد اکٹھا ہو رہے ہیں۔ میں کسی کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ لیکن محسوس کر سکتا تھا۔ لگتا تھا جیسے میرا پورا وجود آنکھ بن گیا ہو حالانکہ میں تو نابینا ہی تھا۔ Hellen Keller کی طرح! یا شاید میری آنکھوں پر بھی اباجی کی دھندلائی ہوئی ''حکمت کی نظر'' جیسی کوئی عینک آ بیٹھی تھی۔ جو میں نے اب تک سنبھالی ہوئی تھی۔ بڑے بھائی کے صندوق میں ۔۔۔۔۔۔!''

یا میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ اپنے عمر سے دس برس آگے نکل گیا تھا۔ یہی کہتا تھا میرا دوست کہ ''تیرے مرنے کے دس برس بعد ہی لوگوں کو تیری باتیں سمجھ میں آ سکیں گی۔'' پھر وہ ہنس دیا کرتا۔ ہنسئے مت! آپ پر بھی بڑھاپا آ جائے گا، تب ایسا ہی ایک چشمہ آپ کی آنکھوں کے آگے ہوگا جس کے پار ہو کر آپ کی نظر بھی ''پر حکمت'' ہو جائے گی۔

کبھی کبھی وہ تنگ کرتا۔ ''دیکھنا ایک دن تو دوسرا ''وہ'' بن جائے گا۔ وہ کسی مشہور ادیب کی شان میں گستاخی کرتا جو میرے حساب سے انسانی ذات کی ایسی ''کھولی'' میں مقید رہا جہاں آنے جانے کے لیے صرف چور دروازوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے اندھیرے میں کوئی اور رنگ سجھائی نہیں دے سکتا۔ مگر میں تو ایسی گھٹن میں جیتا نہیں رہ سکتا تھا، چاہے مسئلہ روزی کا ہی ہوتا۔ میرے نزدیک انسان کی ذات منشور کی طرح ست رنگی تھی۔ بالکل ان کرداروں کی طرح جو پرندوں کی طرح، خودبخود میرے اردگرد جمع ہوتے رہتے۔ وہ میرا مشاہدہ تھے۔ کھلی کھڑکیوں اور کھلے دروازوں میں سے۔ میں ان سے مانوس تھا اور وہ مجھ سے۔ وہ مسکراتے، چہکتے، باتیں کرتے اور میں کاغذوں پر ان کے رویوں کی تصویریں اتارتا تھا۔

میرا اپنا بسیرا بھی تو پرندوں کی طرح ایک پیڑ پر تھا۔ یا پھر، پیڑ جیسی ماں کی ذات، جس سے لپٹے لپٹے نا جانے، کتنی صدیوں میں Metamorphis جیسے طویل عمل کے انگنت مراحل کے بعد میں اپنے Chrysalis جیسے خول سے باہر نکل آیا تھا۔ میں خوش رنگ تتلی تھا یا بے رنگ پتنگا، مگر میری آنکھیں اندھیروں کے لمبے سفر کے بعد ایسے اجالے میں کھلی تھیں جو ممتا کی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔ ایسی دنیا۔۔۔ جہاں مائیں رہتی تھیں۔۔۔ مائیں جو ''وچھوڑوں'' کے حال اچھی طرح جانتی ہیں۔۔۔ مجھے لگا میں ابھی پیدا ہوا ہوں اور شاید بہت جلد مر جاؤں گا۔ مجھے ڈر تھا کہ مشاہدے کی اندھی آنکھوں میں اتنی لمبی نیند کے بعد جو توانائی اکٹھی ہوتی ہے وہ بہت جلد منتشر

ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایسی زندگیوں کا Span بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔۔۔ شاید میں جلدی میں تھا۔

پھر ایک روز اسی دوست کی وساطت سے مجھے کتابوں کی کمپنی میں ملازمت کی آفر ہو گئی۔ ماں کی دعاؤں نے رزق کا جو دروازہ میرے لیے کھولا تھا میں اس میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

شاید یہ کتاب اسی باغ کا ثمر ہے۔ جہاں ماں آباد ہے۔۔۔۔۔۔ میری کہانیوں کی پہلی کتاب ۔۔۔۔۔۔ جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے ۔۔۔۔۔۔ "کچھ کرنے" کی سند جیسی کتاب "جو بوقت ضرور کام آسکے۔"

اندھیرا بڑھ چکا ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ کبھی کبھی بجلی چمکنے سے ماں کی قبر پر لگا کتبہ بھی چمک اٹھتا ہے۔

یکدم ایک موٹی بوند میرے ماتھے پر گرتی ہے۔ آسمان کا ارادہ بھانپتے ہوئے میں آگے بڑھ کر، کتاب کو ماں کے کتبے کے سہارے کھڑا کر دیتا ہوں۔ اچانک میری نظر موتیے کے ایک ننھے منے سے پودے پر پڑی ہے جو قبر کے دائیں پہلو پر اگا ہوا ہے۔ پودے پر چند تازہ تازہ پھول مسکرا رہے ہیں۔ میں مبہوط ہو کر کانپتے ہاتھوں سے پودے کو چھو کر پیار کرتا ہوں۔ پھر نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ ایسے جیسے خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری آنکھیں گرم گرم آنسوؤں سے لبالب بھر چکی ہیں۔

اچانک تیز بارش برسنے لگی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں نے میرے آنسو دھو ڈالے ہیں۔ میں شکرانے کی دعا میں اٹھتے ہوئے ہاتھوں سے منہ پونچھ لیتا ہوں۔ لگتا ہے بارش نہیں ماں کا آنچل ہے۔ بھیگا ہوا۔

بارش کے پانی میں غسل کیا ہوا موتیے کا پودا، اپنی ننھی منی پتیاں اٹھائے دعا میں مشغول ہے۔

کتبے کے پہلو میں پڑی کتاب بالکل بھیگ چکی ہے بجلی چمکتی ہے۔ کتاب کا ٹائٹل نمایاں ہوا ہے۔

"کھدو" ۔۔۔۔۔۔ میں کانپتے ہاتھ جیب میں ڈالتا ہوں۔ میری انگلیاں کسی گول شے سے ٹکرائی ہیں۔ "کھدو" لیروں کا گولا ۔۔۔۔۔۔ لگتا ہے اس میں اب بھی ویسی ہی گرمی ہے جیسے میں نے ابھی ابھی ماں کے بستر سے اٹھایا ہو۔

گول مٹول کھدو ۔۔۔ لگتا ہے ساری کائنات میں کھدو ہی کھدو پھیلے ہوئے ہیں۔ قوسِ قزح سے رنگین کھدو ۔۔۔ چھوٹے بڑے کھدو ۔۔۔ اور کوئی چھپ کر اُن سے کھیل رہا ہے۔

TOO FAR

دو سرخ آنکھیں، گھپ سیاہ اندھیرے کے بے ہنگم جسم پر Laser Lights کی طرح نمودار ہوئیں اور چند ہی ساعتوں کے توقف کے بعد دیو قامت مکڑے کا ہیولہ، تاریکیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اپنی کھردری، خاردار ٹانگوں کے اگلے جوڑے کی مدد سے مکڑے نے الماری کے اوپر والے شیلف کو ایسے ٹٹولنا شروع کر دیا جیسے وہ دیکھ سکتی ہوں اور جانتی ہوں کہ Joe کہاں چھپا ہوا تھا۔ الماری کے شیلف میں جہاں Encyclopedia Britanica کے درجنوں والیومز بلحاظ ترتیب، مرتب و باادب کھڑے تھے۔ ذرا شک ہی نہیں گزر سکتا تھا کہ Joe دراصل انہی پہریداروں میں سے کسی ایک کی پناہ لئے ہوئے ہانپ رہا تھا۔

اب تو Joe کی خیر نہ تھی۔ بس کچھ ہی دیر میں مکڑے کی تلاش کامیاب ہو جائے گی اور بے چارہ Joe ننھی منی مکھی کی طرح مکڑے کا نوالہ۔۔۔۔۔۔!

مگر نہیں! یہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ Joe اس کھیل کا Hero تھا۔ اس کا قد چھوٹا ضرور تھا مگر طاقت میں وہ مکڑے کی جسامت سے کئی گنا زیادہ تھا۔ یہی نہیں اس کے اخروٹ کے سے نصف جوز جتنے دماغ میں چھپی ہوئی ذہانت بھی مکڑے کی موٹی کھوپڑی کھولنے کے لیے کافی تھی۔

موقع غنیمت جانتے ہوئے اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو کتاب کی بیرونی جلد سے رگڑا ہی تھا کہ اس کی انگلیوں کے پوروں سے سبز رنگ کی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور شیلف کا کونہ اس Glow in Dark جیسے ماحول میں جگمگا اٹھا۔ پھر جیسے ہی مکڑے کی ٹانگ Joe کے Laser Beam جیسے سفاک ہتھیار کی کاٹ پر آئی، جلی اور بھن کر کباب ہوگئی۔

اب تو Joe پر جوش انداز میں آگے بڑھا اور کتابوں کے درمیان جگہ بنا کر مکڑے پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ ایک نشانہ تو عین مکڑے کی آنکھ کا تھا جس نے مکڑے کی ایک بتی گل کر دی۔ مکڑا بے چارہ کسمسا کر رہ گیا اور آن کی آن میں تاریک گہرائیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔

مکڑے کے جاتے ہی Joe فرش پر کودا اور اپنے کمر بند پر آویزاں ایک بٹن دبا کر اپنی اصلی قدروقامت میں واپس لوٹ آیا اور جب اپنی فتح کا اعلان اس نے اپنے بازوؤں کے ساتھ ساتھ Hurray کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کیا تو۔۔۔۔۔اس کی آنکھ کھل گئی۔

☆☆☆

کمرے میں زیرو کے بلب کی ہلکی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

Are you alright۔شازیہ کے نیند سے بوجھل لہجے نے کمرے کا سکوت توڑ ڈالا، جو دروازے کی اوٹ سے ایک آنکھ ملتے ہوئے اپنے بیٹے کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کررہی تھی۔

Ohh.......I m Fine!..........آپ جائیں ماما!

بستر پر بیٹھے ہوئے، دس سالہ Joe نے قدرے جھینپ کر کہا اور پھر کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

"So Dreaming, Again....You Naughty Boy!"

اور وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لوٹ آئی، جہاں اس کا شوہر محمد عاطف اور ننھی منی، ڈیڑھ سالہ Tina، بے خبر سو رہے تھے۔

محمد یوسف عرف Joe کے خواب کوئی نیا قصہ نہ تھے۔ایسے خواب تو وہ ہفتے میں نہیں تو، مہینے میں ایک بار ضرور ہی دیکھ لیا کرتا تھا۔خصوصاً Weekends کی راتوں میں شازیہ کو اکثر ہی ان بن بلائے مہمانوں کی تشریف آوری کا انتظار ہوتا! جب جمعے کے روز Drawing Class میں Joe صاحب کسی نہ کسی نئے Drawing Project کے سلسلے میں، کوئی نہ کوئی نئی ایجاد کر کے آئے ہوتے۔پھر ساری شام گھر کی فضا میں گرم گرم ایجادات کی بھاپ اڑتی رہتی اور رات کو Joe کا بستر ایسے ہی بھوتوں کی آماجگاہ بن جاتا جیسے آج جب Class کو Imaginary Alien بنانے کا موقع دیا گیا تو بچوں نے عجیب الخلقت بلاؤں سے بھرے ہوئے کاغذوں سے ٹیچر کی Bin بھر دی۔Joe نے بھی اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو جو غالباً موروثی تھیں، بروئے کار لاتے ہوئے ایک مکڑے نما جن بنا ڈالا جس کی آٹھ نہیں، چار ٹانگیں تھیں۔

ایسے شاہکار ہمارے ہاں بچے دیکھ لیں تو ڈر جائیں، بڑے شور مچانے لگیں اور بوڑھے ۔۔۔لاحول ولاقوۃ کا ورد کرتے ہوئے سب سے قطع کلامی کا اعلان کر دیں۔۔۔مگر وہ تو مغرب

تھا۔ جہاں بچے ایسی ایجادات پر فخر کرتے ہیں۔ ٹیچرز Perfect کہہ کر داد و تحسین دیتے ہیں، بڑے لاجواب ہو جاتے ہیں اور بوڑھے برملا کہہ اٹھتے ہیں کاش ہم بھی اپنے زمانے میں اتنے ہی Creative ہوتے! حالانکہ ------ جہاں پر ہر دھائی گزرتے ہی نیا زمانہ شروع ہو جائے وہاں قبل از وقت ایسے ایڈونچرزان کے ہاتھ کس طرح لگ جاتے ------

اسی طرح جب بچوں کو Language Class میں کہا جاتا کہ

Write About What You Did Last Week?

تو بچے مقابلتاً، انوکھے اور اچھوتے من گھڑت قصوں سے سفید کاغذوں کے منہ پر کالک مل دیتے۔

☆☆☆

"عاطی! ------ تو کیا اس طرح بچے جھوٹ بولنا نہیں سیکھ جاتے!"

ایک روز شازیہ نے Computer Screen میں اپنے دبیز چشمے سمیت ڈوبے ہوئے عاطف کو باہر بلایا۔

"ہونہہ، اوں ------ ہاں ------ ارے بھئی نہیں ------ میرا مطلب ہے یہی تو Creativity ہے ناں جان!" اس نے اپنا دھیان، اپنے سر سمیت شازیہ کی طرف گھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے بولا:

"یہ آزاد خیال لوگوں کی دنیا ہے شاز، میرا مطلب ہے Free Socity, کی Practice کہہ لو یا پھر Training کہ بچے کی Vast Imaginations کو کیا جائے۔ وہ ہر موضوع پر آسانی سے بات کر سکے، لکھ سکے۔ ہونہہ!"

تمہیں تو یاد ہو گا ہم کس طرح مضامین کے رٹے لگایا کرتے تھے۔ انگریزی تو پرائی زبان تھی مانا کہ Rainy Season اور Summer Vaction پر اظہار خیال ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ مگر شاز، میرا گھر، میرا اسکول، میرا گھوڑا اور تمہاری گائے ------ وہ توقف دے کر مسکرایا۔ میرا مطلب ہے چند سادہ، باتیں، بنانا، بھی تو نہیں آتا تھا ہمیں!"

شازیہ سنتی گئی کیونکہ عاطف کی توجہ حاصل کرنا خاص طور پر بحث کے لیے ایک امر محال تھا۔

"لیکن عاطی! تم نے سنا ہو گا "There's No Freedom Without a Law!"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ہمیں کم از کم یہ لحاظ تو تھا ناں کہ میری گائے ------ وہ توجہ کھو جانے کے ڈر سے

مسکرائی۔۔۔۔۔۔کی دو آنکھیں، دو کان اور چار ٹانگیں ہی ہوتی ہیں اور یہ کہ وہ چارہ کھاتی ہے اور دودھ دیتی ہے۔کوئی چار آنکھوں اور دو ٹانگوں والی گائے تو ایجاد نہیں کردی تھی ہم نے

۔۔۔۔۔۔

"جو دودھ پیتی ہو اور چارہ۔۔۔۔۔۔" عاطف نے زوردار قہقہہ لگا کر بات کا رخ پلٹنا چاہا۔

"اور نہ ہی میں نے اپنے گھوڑے کا سر، تمہاری گائے کے جسم پر لگانا چاہا۔یہی مطلب ہے نہ تمہارا۔۔۔۔۔۔مگر It's a free country۔

"اچھا چلو ایک کپ کافی ہو جائے پھر بات ہوگی!"

اور پھر بات نہیں ہوگی۔شازیہ کو معلوم تھا، اسی لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر کچن میں کافی بنانے لگی۔پتہ نہیں کیوں کوئی بھی Discussion ہو، درمیان میں کہیں سے کافی ضرور آ جایا کرتی۔چلو آج تو دسمبر کی یخ بستہ شام کا تقاضا سہی، ورنہ موضوع بدلنے کے لیے کافی کا موڈ بنا لینا عاطف کا پرانا حربہ تھا۔

عاطف، کمپیوٹر انجینئر تھا۔دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں، اسے اس بات کا یقین تھا۔شازیہ بائیلوجسٹ تھی اور جانتی تھی کہ کبھی کبھی دو اور دو، تین ہوتے ہیں تو کبھی پانچ بھی بن جاتے ہیں۔

مانا کہ بچپن ہی سے اس کے اندر ایک آرٹسٹ بھی پل رہا تھا۔مگر اس کی حقیقت پسندانہ فطرت نے اسے کبھی Fantasy کی دنیا میں بھی "بے پر" کے اڑنے نہیں دیا تھا۔بس یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کو Real دنیا کا Realistic باسی بنانا چاہ رہی تھی۔اور Abstraction کی حدود میں داخل ہو جانے والی Creativity سے گھبرا اٹھتی تھی۔

"تو کیا اختراع کی کوئی حد نہیں ہونی چاہیے، عاطی؟"

کافی کے دو بھاری مگ سنبھالتی ہوئی وہ کچن سے باہر نکلی اور بات بڑھانے کی کوشش میں زور لگایا۔

"اوہ شازی، یار تم ایجادات کی "حد" کیسے مقرر کر سکتی ہو؟ دنیا کی ترقی روکنے کا پروگرام ہے کیا؟"

عاطف نے اپنی دنیا کی تالاب سے سر نکالا اور ایک مگ شازیہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے خوش دلی دکھا کر موضوع کو Light کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہ نئے Softwares، نئے ماڈل کی مشنری، نئی ادویات، بھئی یہ دنیا کیسے چلے گی؟

"My Dear Shazi!"

اس نے Screen پر کسی Icon کو Click کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا Limit Cross کرنے سے چلے گی؟ حقیقت اور افسانے کو خلط ملط کرنے سے چلے گی عاطی؟۔۔۔۔نئے ماڈل کی مشنری اور ادویات وغیرہ تو حقیقت ہیں مگر یہ خرافات Super Beings، افسانے! یہ Batman, Spider man کی Imaginary دنیا ہمیں کہاں لے جارہی ہے؟

"Papa, My Turn!" اپنے کمرے کی دنیا سے باہر آتے ہوئے Joe عاطف کے قریب آ کھڑا ہوا اور اپنی ٹانگوں پر بل جل کر گویا ضدی انداز سے باپ کو اٹھنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمپیوٹر کی کرسی ہتھیا لینے کے بعد وہ ٹپ ٹپا کرتے ہوئے ایک پل میں پوروں کے بل پر ایسی Website پر پہنچ گیا جہاں Assembly کے ذریعے طرح طرح کے Aliens بنانے کی Free Choice موجود تھی۔

سوئی ہوئی ٹمنا جاگ اٹھی تو شازیہ نے کافی کا مگ چھوڑ کر کمرے کا رخ کیا۔ عاطف Magzine کی ورق گردانی کرتے ہوئے اپنی دنیا میں کھو گیا۔

باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ شازیہ کے مگ میں کافی، موضوع کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز وہ سب، فلک بوس بلڈنگز کے درمیانی احاطے میں، تازہ برف سے Snowman بنانے نیچے اتر آئے۔ جہاں ایڈونچر اور فن کے موڈ میں سرشار بچے، بڑے اور بوڑھے Snowsuits میں ملبوس جمع تھے۔ ہر ٹیم چونکہ اس کوشش میں تھی کہ ان کا بنایا ہوا سنو مین سب سے بڑا دکھائی دے اس لیے وہ برف کے گولوں کو ادھر سے ادھر لڑھکانے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر رہے تھے تاکہ گولے زیادہ سے زیادہ برف اپنے گرد لپیٹ سکیں اور تین گولوں پر مشتمل سنو مین کو زیادہ بڑی جسامت دے سکیں اور پھر عاطف اور یوسف نے مل کر بھی ایک درمیانے قد کا سنو مین کھڑا کر دیا جس کی تکمیل کے تمام مراحل شازیہ اور ٹمنا، پاس بیٹھ کر برف کے چھوٹے چھوٹے گولے بناتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

عاطف نے جوس کی بوتل کے چھوٹے ڈھکنوں سے سنو مین کی آنکھیں اور یوسف نے بڑے

ڈھکنوں سے دھڑ کے بٹن بنائے۔ شازیہ نے اٹھ کر نارنجی گاجر ناک کی جگہ ٹھونک دی۔ پھر ایک پرانا مفلر، بغیر گردن کے سنومین کے شانوں کے گرد گھما دیا گیا اور آخیر میں سفید گنجے سر کو کالے ہیٹ نے ڈھانپ لیا تو ننھی ٹینا چلا اُٹھی:

"No Man Mama......"

پھر اسی شام گھر لوٹنے کے بعد کافی کے گرم مگس ہاتھوں میں تھام کر عاطف اور شازیہ بالکنی میں کھڑے، آٹھویں منزل سے احاطے میں پھیلے ہوئے Canvas پر بنے تازہ سنومینوں کی Paintings میں کھوئے ہوئے تھے تو شازیہ نے چپکے سے عاطف کے کان میں سرگوشی کی۔

"عاطی! یہ سنو مین بھی کتنا Naive ہوتا ہے ناں! اس میں کوئی Super Power یا غیر معمولی ذہانت موجود نہیں اور صدیوں سے اس میں کسی Imaginary طاقت نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ویسے کا ویسا ہی ہے!"

عاطف نے شازیہ کی آنکھوں میں جھانکا جہاں معصومیت تھی اور سچائی بھی۔

"چلو اندر چلیں۔۔۔" عاطف نے کافی کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہی موضوع پر فل سٹاپ لگانے کی کوشش کی اور دونوں سرد فضا کو چھوڑ کر Living room کی گرم گداز گود میں آ بیٹھے۔ Cot،Tina میں ابھی تک سو رہی تھی اور Joe کمپیوٹر میں آنکھیں دیئے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

امریکہ کے اس مشہور شہر میں بسے ہوئے انہیں تین سال ہونے کو آئے تھے۔ مگر Isolatry فضا کے باعث وہ گرد و نواح سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ محلے داری کا زمانہ بھی نہیں رہا تھا اور Jobs کے مختلف Schedules سبھی کو اپنے اپنے گھر کی مصروفیات میں کھوئے رہنے پر مجبور کر دیتے۔ عاطف ایک Job Offer پر امریکہ آیا تھا اسی لیے کسی کھینچا تانی کے بغیر ہی زندگی معمول اپنا چکی تھی۔ عاطف کی انکم معقول ہونے کی وجہ سے شازیہ کو باہر نکلنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ویسے بھی مغرب کا ماحول بھانپ لینے کے بعد وہ یہ جان چکی تھی یہاں Baby Sitters سے زیادہ بچوں کو اپنی ماؤں کی ضرورت ہے۔ عاطف کی مصروفیات اور طبیعت، دوسری بڑی وجہ تھی۔ جس نے شازیہ کو، بچوں کی تربیت کی خاطر، اپنی مصروفیات کم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بس کبھی کبھی خود سے ملاقات کرنے وہ پینٹ اور برش سنبھالے کینوس کے آئینے کے روبرو آ کھڑی ہوتی۔

یہ بھی Tina کے سال بھر کے ہو جانے کے بعد ہی ممکن ہوا تھا کہ وہ ایک قریبی Art Shop سے Painting کا کچھ سامان خرید لائی تھی ورنہ اس سے قبل تو یوسف ہی ساری توجہ لے لیا کرتا اور وقت بھی۔

یوسف امریکہ آیا تو ساتویں سال میں تھا۔ قاعدے کے مطابق اسے گریڈ ون میں داخل کیا گیا۔ اپنی British Education System, Pre-Schooling کے شکنجے میں حاصل کرنے کے بعد جب American Style کی آزاد فضا میں ہوا خوری کا موقع ملا تو وہ اڑنے ہی تو لگا تھا۔ عاطف نے یوسف کو Joseph سمجھتے ہوئے Joe بنا ڈالا تو وہ اور بھی ہلکا ہو گیا۔

کبھی سائیکل چلا رہا ہے تو کبھی سکوٹر بھگا رہا ہے۔ کبھی ٹی وی میں آنکھیں دیئے بیٹھا ہے تو کبھی کمپیوٹر میں سر دیئے، مغز ماری کر رہا ہے۔ کبھی Skating، کبھی Skiing اور کبھی Sledging۔ کبھی ہاتھوں میں Soccer Ball ہے تو کبھی Basket Ball ـــــــ ہر وقت جلدی پر ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی بے چینی، پورا یا ادھورا never mind ۔ یہی رواج تھا نہ مغرب کا ـــــ اور حد ـــــــ Sky Is the Limit! ۔ یہی نعرہ تھا غالباً ـــــ کچھ نیا، کچھ الگ،

Something Cool, Something Super, Something Super cool....!

ایسی ہی دھن ہوگی جو ایک بچہ خود کو Super Man سمجھتے ہوئے پچھلے سال چھٹی منزل سے کود گیا تھا۔

بس ایسی ہی خودکشی سے شازیہ اپنے بچوں کو بچانا چاہتی تھی۔ یہی وہ وجہ تھی جس نے ان کی معمول کی زندگی میں غیر معمولی تناؤ پیدا کر دیا تھا جسے دور کرنے کے لیے وہ اکیلی کوشاں تھی۔

شازیہ بحث کرتی تو اس کا مقصد کسی سے جیتنا نہ ہوتا۔ وہ تو اپنا موقف بیان کرتی۔ جو صرف رائے تھی اور اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا تھا۔ کوئی مفروضہ نہیں جسے ثابت کرنے کے لیے وہ تجربات کرتی اور حوالے اکٹھے کرتی۔ کوئی فلسفہ نہیں تھا جسے ہر دفعہ چیلنج کیا جاتا۔ وہ عالم تھی نہ فاضل کہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیتی۔ اس کے پاس کچھ تھا تو وہ تھی اس کی مثبت سوچ ـــــ اس کی

سادگی اور سچائی۔۔۔۔۔۔جس کے بل پر وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ سب ساتھ ہوں۔کوئی آگے نہ پیچھے۔۔۔۔۔سب خوش ہوں۔۔۔۔۔۔مطمئن ہو جائیں۔۔۔۔۔۔!

کبھی کبھی تو وہ ہمت ہار دیتی اور Tina کے ننھے منے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر اپنے آنسو پونچھتی جاتی اور کبھی کبھی سپاہیوں کی طرح کمر کس کر کھڑی ہو جاتی۔۔۔۔۔۔اور اپنا موڈ کنٹرول میں رکھتے ہوئے رعب جمالیتی۔

جب ممکن ہو سکے، یوسف کو باپ کے ساتھ مسجد جانے پر مجبور کرنا، اتوار کے روز یوسف کو قرآن کلاس بھیجنا، روزوں کا اہتمام، عیدوں کی تیاریاں۔۔۔۔۔۔مگر یہی نہیں وہ چاہتی تھی کہ کہیں مذہب کا تصور، رسم ورواج کی پابندی اور Fun کے درمیان دب کے Sandwitch نہ بن کر رہ جائے۔ جسے کھا کر روح کو جلا تو کیا ہوا بھی نہیں ملتی۔اسی لیے وہ Discussion کرتی۔ ایک خدا کے تصور کو شرک کی آلودگیوں سے نکال کر باہر لانے کے لیے زور لگاتی۔شب معراج اور شب قدر کی راتوں کو ان راتوں سے الگ کرنے کی کوشش کرتی جن میں بچے سانتا کلاز یا جادوگرنیوں اور بھوتوں کا انتظار کرتے ہیں۔پیغمبروں اور اللہ والوں کی تعلیم اور معجزات کی اہمیت اور حکمت کی Super Beings کی شعبدہ بازیوں سے مختلف، ثابت کرنے کی کوشش کرتی اور کبھی Harry Poter کے جادوئی کمالات سے۔۔۔۔۔۔کبھی سوچ اور عمل کی سمت کی وضاحت کرتی تو کبھی اصلاح اور حدود کی نشاندہی کرنے کی فکر میں ہوتی۔جو روش بھی تھیں، سلجھاؤ بھی، نجات بھی، حالانکہ کبھی کبھی وہ خود بھی اختیار اور مختار کے مسئلے میں الجھ کر رہ جاتی۔ Free Will اور Free Choice کے گھن چکر میں گم ہو جاتی اور پھر کچھ نہ کچھ ادھورہ ہی رہ جاتا جس سے اسے اپنی ناکامی کا احساس ہوتا رہتا۔بالکل ویسا جیسی ادھوری ڈرائنگو اور Paintings جن سے آج بھی اس کے Living room کا ایک کونا آباد تھا۔

مگر اس کی ذات میں شاید ایک خوبی ایسی تھی جو اسے Depressions کے ایسے Spells سے باہر نکال لیتی تھی۔۔۔۔۔۔کوشش! کوشش کرتے رہنا۔۔۔مگر جہاں تک یوسف کا تعلق تھا وہ ابھی بچہ ہی تو تھا۔ایک طرف وہ ماں کی تربیت کا لحاظ بھی رکھ لیتا اور ناراضگی کا بھی۔مگر دوسری طرف باپ کے لاڈ پیار کی دی ہوئی آزادی سے فائدہ اٹھانا بھی اس کا حق تھا۔سو وہ اس حق کو بھی کیش کرتا رہتا۔جس کی بدولت ایک طرف تو چند روایتی کھلونوں سے، تو دوسری جدید دور کی

خرافات سے اس کا کمرہ بھرتا جارہا تھا جن میں خاص طور پر اس کی وہ جمع پونجی تھی جسے Super Collection کہتا، جس میں Superman، Spiderman، Betaman، Pokeman، اور پتہ نہیں کیا کیا انواع واقسام تھیں ان شکتی مانوں، پہلوانوں کی جن میں کھویا ہوا وہ اپنا۔۔۔۔۔۔Man-Man۔۔۔۔۔۔"یوسف" تلاشتی رہتی۔

☆☆☆

اس نے آہستگی سے Joe کے کمرے میں جھانکا، جہاں اس کا جگر گوشہ شام کے اس پہر نیند کے مزے لے رہا تھا۔ شاید اپنے ایجاد کردہ انوکھے اڑن کھٹولے میں جسے وہ Hover Power کہہ رہا تھا، آسمان کی سیر کو نکل گیا ہو۔ یا شاید Gym Class کی تھکن اتارنے کی کوشش جس میں آج ٹیچر نے بچوں کی دوڑ Outdoor، یخ ہوتے ہوئے گراؤنڈ میں لگوادی تھی۔ اکثر Supply Teacher، وقت گزاری کے لیے ایسا ہی کرتی جس سے بچے زیادہ مصروف ہوجائیں اور انہیں اصل ٹیچر کی طرح زیادہ کھپنا نہ پڑے۔

بس ایسا ہی کوئی موقع ہاتھ آجاتا تو وہ ادھوری پینٹنگ کی تکمیل کے بارے میں سوچنے کی فرصت حاصل کرلیتی۔ Tina سو رہی تھی اور عاطف کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ وہ اکثر جمعے کی شام دیر سے لوٹتا۔ سکیجول ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ اپنے لیے کافی بنالائی اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر دیوار پر ٹنگی ہوئی اس تصویر کو گھورنے لگی جو اس نے اسی میز کے اوپر ہی جھکے ہوئے کیلوں پر لٹکادی تھی جس پر پینٹنگ کا سامان اور چند کتابیں پھیلی ہوئی تھیں مگر میز کا سامان جتنا بکھرا ہوا تھا اتنی ہی منظم تھا Painting کا ماحول، جس پر دور پس منظر میں برف پوش چوٹیوں کے ہیولے۔ بادلوں سے دھندلاتے ہوئے آسمان کی طرح، تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ قریب کے پس منظر میں پہاڑوں پر چند بوسیدہ Huts پھیلی ہوئی تھیں جو سدا بہار درختوں کے جنگل میں مکمل طور پر واضح نہیں ہورہی تھیں۔ قریبی اطراف میں دیو قامت چیڑ کے درخت پیش منظر کے انتظار میں مگن کھڑے تھے جو ابھی تک طے نہیں کیا گیا تھا۔

رنگوں کے انتخاب اور امتزاج کی کیفیت سے ظاہر تھا کہ بننے والی تصویر بہترین Ariel Perspective میں ہوگی۔ ہر طرف پھیلی ہوئی پراسرار روشنی اور ٹھنڈک کا احساس، نہ صرف ظاہر کررہا تھا کہ وطن کے کسی Hill Station کی کوئی یاد تازہ کرنے کا پروگرام تھا بلکہ

Suggest کرر ہے تھے کہ پیش منظر میں آگ کا الاؤ ہونا چاہیے جس میں جلتے بجھتے سایوں جیسے کچھ لوگ ہاتھ تاپ رہے ہوں۔

شازیہ کافی کے ہونٹوں سے لگے مگ سمیت مسکرا اٹھی۔ مگر اس کے جگہ چھوڑنے سے پہلے ہی، درختوں کی اوٹ سے ایک روبوٹک مخلوق برآمد ہوئی۔ جسے دیکھ کر سایوں میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ مگر یہ ان کی خوش خیالی ہی تھی کہ وہ بے حس دشمن کو آدم دوست تصور کیے ہوئے تھے۔ دو روبوٹک ہاتھوں نے، قریب کے دو سایوں کی گردنوں کو دبوچ لیا اور میکانی طریقے سے ہوا میں بلند کر دیا۔ چند ساعتوں میں کڑاک کی آواز پیدا ہوئی اور سائے زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

یہ غالباً، اپنے ہی کئے کی سزا تھی۔

انسان جو خود کو مغلوب مخلوق کے زمرے سے نکال کر غالب خالق کے روپ میں دیکھنے کے لیے بے چین ہے جس کا تحت الشعور Playing Gods کی ہوس سے آلودہ ہو چکا جس کے ترقی یافتہ دماغ میں Artificial Intelligence (AI) لیے طرح طرح کے Designer Humans بل رہے تھے جو Genetic Engineering کے ذریعے Perfection کی ان حدود کو چھونا چاہتا ہے جہاں پر Super،Human Beings Beings میں بدل جائیں گے۔ جو اعلیٰ ترین تکنیکی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے Hormones اور Neuro Transmater کے بہترین امتزاج کا، کسی آئیڈیل مشین جیسا، میکانی شاہکار بنانے کے لیے ہر قسم کا اخلاقی خطرہ مول لے لینا چاہتا ہے۔

مگر یہ سب اس کی خام خیالی ہے۔ سائنس Fiction لکھنے والے یا Futurist انہیں کتنا بھی انسان دوست دکھا کر پیش کرلیں، وہ جذبات اور احساسات سے ناواقف مخلوق Demigods یا Monsters تو ہو سکیں گے ، Perfect عورت یا Perfect مرد نہیں۔ کیونکہ عورت اور مرد بنانے والی طاقت تو وہ مادرانہ او پدرانہ صلاحتیں ہیں جو انسان کے انسانی معاشرے میں پرورش پانے سے پروان چڑھتی ہیں۔ جو اسے دوسروں کے لیے قربانی دینا سکھاتی ہیں اور آئندہ کے لیے اس کی نسل کے بقا کی امید دلاتی ہیں۔

انسان نے کلہاڑا تو اٹھا لیا ہے مگر یہ نہیں دیکھ سکتا کہ نیچے اس کا اپنا پیر ہے۔

☆☆☆

تصویر کے منظر میں اب نہ کوئی روبوٹک مخلوق تھی نہ سائے۔ بس دھیمی دھیمی آگ آخری سانسیں لے رہی تھی جس نے شاید خود کو نباتاتی زندگی پر قربان کر دیا تھا ورنہ سارا جنگل!!۔۔۔

شاید دور، بہت دور۔۔۔۔۔۔ برفانی چوٹیوں میں۔۔۔۔۔۔ کوئی سایہ پس منظر میں حرکت کرتا دکھائی دیا۔ چال ڈھال میں بندر سے مشابہت رکھنے والا وہ Neanddrathal کی قسم کا قدیمی انسان ہاتھ میں بھالے جیسی کوئی چیز اٹھائے ہوئے تھا۔ غالباً وہ، مار دھاڑ کا شور سن کر جاگ گیا تھا اور Self-Defence کے Primitive قدرتی احساس نے اُسے پس منظر سے پیش منظر تک کا طویل سفر طے کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے صرف اپنے بال بچوں ہی کا خیال نہ تھا بلکہ وہ ہر چرند پرند اور نباتات کے بارے میں بھی اتنا ہی متفکر دکھائی دے رہا تھا کیونکہ اس کی چھوٹی کھوپڑی نے جو ابھی ارتقا کے ابتدائی مراحل ہی میں تھی اسے آسمانوں پر نہیں اڑایا تھا۔ وہ زمین پر تھا۔ قریب آ کر اس نے چاروں طرف نظر گھمائی وہاں کوئی نہیں تھا۔

پیش منظر میں آگ بجھ چکی تھی۔ اس نے قریب پڑے ہوئے دو پتھر اٹھائے اور انہیں آپس میں رگڑ رگڑ کر آگ جلائی اور بیٹھ کر تاپنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر نظر اٹھا کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اچانک ہی اس کی نظر شازیہ کی نظروں سے ٹکرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں تضحیک آمیز چمک نمودار ہوئی!

شازیہ گھبرا کر باہر بالکنی میں نکل گئی جہاں بچے تازہ برفباری کا مزہ لوٹتے دکھائی دیئے۔ رنگ برنگے Snowsuits میں ملبوس بچے تازہ برف کے Canvas پر تتلیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر، اِدھر سے اُدھر اڑے جا رہے تھے۔ کچھ پرانے سنومین یہ سارا کھیل اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ نہایت بردباری سے ان کی شرارت اور بدسلوکی بھی سہہ رہے تھے۔ جو نہایت بے حسی سے کبھی ان کا ہیٹ اتار دیتے یا پھر ناک اکھیڑ دیتے۔ ان میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ ان کی اپنی مرضی بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔۔!

کچھ سوچ کر شازیہ اندر بھاگی۔ وہ اب سردی سے کانپ رہی تھی۔ Tube سے Pallette پر سفید پینٹ نکال کر وہ لت پت برش کو چھپا چھپ canvas کے چہرے پر چلاتی رہی۔

دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں پر اجلی چادریں بچھ گئیں۔ بوسیدہ Huts نے بڑی بوڑھیوں کی سی اوڑھنیاں اوڑھ لیں۔ سدا بہار درختوں کی بانہیں روئی جیسے بڑے بڑے گالوں سے لد گئیں۔

چھپ چھپ چھپ۔۔۔۔۔۔پیش نظر کا الاؤ بھی سفید پوش ہو گیا۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔۔دروازے پر عاطف تھا۔شور سن کر Joe آنکھیں ملتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔Tina کی اوں اوں سن کر شازیہ اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

ادھوری پینٹنگ پر سفید دھبے سوکھتے رہے۔

☆☆☆

ویسے تو شادی سے پہلے بھی شازیہ کا کمرہ ایسی ہی ادھوری پینٹنگز سے بھرا رہتا۔جن کی بڑی وجہ امی کی طرف سے مزاحمت تھی۔ابو کی حوصلہ افزائی سے جب کبھی نہ کبھی، کوئی تصویر مکمل ہو ہی جاتی تو وہ اسے اپنے ہی کمرے میں لٹکا کر خوش ہو جاتی یا کبھی چھوٹا بھائی یا کبھی کوئی سہیلی مانگ کر لے جاتے۔

نیچر اور کلچر سے تو لگاؤ تھا ہی۔مگر چہروں میں دلچسپی زیادہ تھی۔اس لیے کبھی کبھی Portraits کی مشق بھی کر لیا کرتی۔ بھائی یا کسی سہیلی کو زبردستی ماڈل بنا ڈالتی۔اپنے دادا جی کی طرح Calligraphy بھی کر لیا کرتی۔خانہ کعبہ یا کسی مسجد کے ڈیزائن کے اوپر کلمہ یا آیات لکھ کر اسے روحانی خوشی حاصل ہوتی مگر ایک روز جب اس نے خطبہ جمعہ کا منظر ذہن میں رکھتے ہوئے، پرانے عرب کے پس منظر پر روتے ہوئے چہروں کے ہجوم میں ابائے اور شملے میں ملبوس کوئی پشت واضح کرنے کی کوشش کی تو امی بھڑک ہی اٹھیں۔"یہ صرف آپ کی دی ہوئی چھوٹ کا نتیجہ ہے جی!" اور ان کے غصے کا رخ ابو کی طرف مڑ گیا۔

جو ذرا جھینپ کر بولے:"شازی بیٹا! میں نے کہا تھا ناں کہ ہمارے مذہب میں پیغمبروں یا اللہ والوں کی تصویر کشی نہیں کیا کرتے۔" اور امی کو منانے کے لیے"اللہ" والی تصویر کے لیے دیوار پر کیل ٹھونکنے لگے جسے وہ روز ہی لگانا بھول جایا کرتے تھے۔

تصویر میں اللہ کے لفظ سے سفید شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

شازیہ کا قصور صرف اتنا ہی تھا کہ وہ اپنے کانونٹ سکول کی راہداریوں اور ریٹائرنگ رومز میں مذہبی تصاویر دیکھ دیکھ کر مانوس ہو گئی تھی۔

"امی تو کیا مذہبی پیشواؤں کی تصاویر بنانے سے ان کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔" ڈرتے ڈرتے اس نے امی سے پوچھ لیا۔

''نہیں!۔۔۔۔۔۔پرستش شروع ہو جاتی ہے۔'' گویا امی نے حد مقرر کر دی۔ اس رات وہ بے چین رہی۔

اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے یوسف جو نہ جانے کب اس کے پاس آ گیا تھا، کو کروٹ دلا کر وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا تمام جسم پسینے میں لت پت تھا۔ وہ بے چین بھی تھی اور مطمئن بھی۔ پانی کا گلاس اٹھا کر وہ کچن سے نکل کر Dining Table پر آ بیٹھی۔ سبھی سو رہے تھے مگر اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ کھڑکی کے باہر ہلکی پھلکی Flurries گرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر لگی ادھوری پینٹنگ سوکھ چکی تھی۔

آج سہ پہر سکول سے واپسی پر یوسف پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تمام رستہ خاموشی میں ہی گزار دیا۔ حالانکہ ویک اینڈ پر وہ آرٹ کلاس میں کئے ہوئے اپنے کارنامے سنا کر کان پکا دیا کرتا تھا۔

What's the Matter Joe? ماں کے کئی بار استفسار پر بھی وہ کچھ نہ بولا تو شازیہ نے منانے کے لیے ایک پیش کش سامنے رکھی۔

''چلو اس Week end پر Wall-E دیکھیں گے!'' مگر یوسف نے بے دلی سے ماں کو دیکھا تو وہ سہم گئی۔

''آخر کیا بات ہے، یوسف، بتاتے کیوں نہیں۔ Come On گھر آتے ہی، Tina کو High Chair کے سپرد کرنے کے بعد شازیہ نے یوسف کے پاس آتے ہوئے پوچھا۔ پھر اپنا موڈ سنبھالتے ہوئے بولی۔ اوکے تو Battery Down ہے تمہاری۔ چلو ابھی Charge کیے دیتے ہیں۔ پھر جب اس نے یوسف کی کمر کے اطراف پر +ive اور -ive چلاتے ہوئے اپنی انگلیاں گھمائیں تو اپنے بچپن میں کھکھلا کر لوٹ پوٹ ہو جانے والا یوسف، پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

What happened Joe! come on....

بولتے کیوں نہیں! For God Sake!

وہ مری جا رہی تھی۔

"Mama! Nothing... this time art teacher went too far!"

Joeبول پڑا۔

"مطلب؟"

"I mean he asked "Draw your Gods!"

"پھر؟"

"I asked, "are we supposed to?"

"پھر؟"

Joeبولا۔

"Teacher said....it's up to you... free choice!"

"پھر؟"

"آپ نے کہا تھا۔ God is super Power،وہ نور ہے۔"

☆☆☆

اس ویک اینڈ پر آرٹ ٹیچر کی میز طرح طرح کے فرضی خداؤں کی تصوراتی تصاویر سے لدی پڑی تھی۔ اسی ڈھیر کے اندر، ایک سادہ کاغذ بھی تھا۔ بالکل کورے کینوس جیسا، جس پر لکھا تھا ---محمد یوسف---

کاغذ کے اندر سے کوئی بن آنکھوں کے جھانک رہا تھا۔

دیوار پر لگی تصویر کے پیش منظر میں کھڑا Snowman مسکرا رہا تھا، جس کا پینٹ ابھی تازہ تھا، تازہ برفباری جیسا!

صبح جب Tina پینٹنگ دیکھے گی تو بے اختیار چلا اٹھے گی۔

"No man Mama... "No Man!"

مکتی

13 نومبر۔ ٹورونٹو لیک شور روڈ، جھیل اونٹاریو کے کنارے، جنوب مغربی پارکنگ لاٹ، میں اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے، Bill کو صدیاں بیت چکی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر، ایک ٹک، کسی رسالے کی ٹائٹل سٹوری کی طرح، ونڈ سکرین کے باہر تکتا جا رہا تھا۔ کوئی اندر جھانک کر دیکھ پاتا تو ضرور یہی سوچتا کہ وہ مر چکا تھا اور شاید اسی تشویش میں ایک بار اس کی نبض اور سانسیں ضرور چیک کرتا۔

اسے خود بھی یونہی لگ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے اور شیشے کے تابوت میں بند ہے۔

شام ڈھلنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ مگر اتنا لمبا دن تو اس نے زندگی میں کبھی نہیں گزارہ تھا۔ نومبر کے یہ دن تو ہریالی کے خاتمے تک کی مہلت پوری ہو جانے کا اعلان لے کر آتے، جب بالآخر درختوں کی پژمردہ بانہیں نا اُمید ہو کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے پتوں کی متاعیں، ظالم ہواؤں کی بھینٹ کر ڈالتیں اور مغرور، مچلتی ہوائیں اپنے بھرے آنچلوں کو سڑکوں کے کنارے اور جھیل کی نیلگوں سطح کے شفاف آئینے پر جھاڑ کر آگے نکل جاتیں۔ بس سر اٹھائے سدا بہار درخت دیکھ دیکھ کر طنزیہ مسکراتے رہتے۔ یا پھر کہیں کہیں، اپنی آخری خواہشیں تھامے ادھ کھلے پھول، کیاریوں کے پنگھوڑوں سے جھانکتے رہتے۔

یوں تو ہر گزرتے سال کا یہی معمول تھا۔ مگر اس سال، اس دن، اس وقت اور اس لمحے قدرت کے ساتھ جنگ کا یہ تماشہ Bill کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

ونڈ سکرین کے باہر کی دنیا اندر کی دنیا سے قطعی بے نیاز تھی۔ کسی اوپن ایئر تھیٹر کی پھیلی ہوئی فلیٹ سکرین کے منظر میں، Summer Fun کا سارا رنگ روپ، خزاں کا جاتا ہوا موسم پہلے ہی اجاڑ چکا تھا۔ جھیل کی سطح پر دور دور اکا دکا Boats کیڑوں کی طرح رینگ رہی تھیں جہاں چند

ہی ہفتوں میں برف کی جمی ہوئی شفاف فرش پر Ice-Skating شروع ہو جاتی تھی۔
یہ سب کچھ جھیل کے باہر باہر تک ہی تھا۔ جھیل کے اندر کیا کیا تھا کسی کو معلوم نہ تھا!

☆☆☆

جھیل پر ہونے والے تماشے سے لطف اندوز ہونے والے سدابہار بنچوں پر، جن کی ٹانگیں جڑوں کی طرح زمین میں کھدی ہوئی تھیں، کہیں کہیں کچھ تنہا بوڑھے مرد اور عورتیں شام کی ٹرین کے انتظار میں، سٹیشن کے مسافروں کی طرح براجمان دکھائی دیئے۔ کسی کسی نے اپنے اپنے کتے کی Leash کسی اندھی امید کی طرح اپنے بوڑھے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ کچھ منچلے جوڑے Night Club کا رخ کرنے سے پہلے ٹائم پاس کرنے کی کوشش میں فضول باتوں کو طول دیئے جا رہے تھے۔ بوڑھوں کے بھاری گرم اوور کوٹ ہواؤں کے مزاج میں تبدیلی کی خبر دے رہے تھے مگر جوانوں نے جوانی کی گرم جوشی کی نمائش میں ادھورے کپڑوں پر پہنی ہوئی جیکٹیں اتار رکھی تھیں۔ گھاس کے تختے ابھی ہرے تھے۔ البتہ Maple اور Oak کے پتوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ پچھلے سال کی طرح ان میں کتوں کی Droppings ملی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ غالباً یونیورسٹی سٹوڈینٹس کے Volunteer Work مہم نے کام کر دکھایا تھا۔

کار کے اندر کے ماحول میں سینما ہال جیسی گھٹن تھی۔ ملی جلی باسی خوشبوؤں اور سگریٹ کے دھوئیں سے اٹی دھند میں، ہیٹر کی گرماہٹ رچی ہوئی تھی۔ ریڈیو اور CD-Player کے ساتھ ساتھ ہر چیز پر پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

Bill پر چھایا ہوا تھکاوٹ کا ایک ابدی احساس سیٹ کے اندر تک اتر چکا تھا۔ ابھی تک وہ کسی لاش کی طرح اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں......ایک سفید کاغذ کا ٹکڑا، کفن کے لٹھے کی طرح بچھا ہوا تھا۔

یک دم تیز ہوا کے زوردار جھٹکے سے، ایک ٹہنی ٹوٹ کر کار کی ونڈ سکرین کے باہر عین اس کے چہرے کے سامنے ٹکرا گئی۔ وہ ہڑبڑا کر ہوش میں آ گیا۔ اس کے پپوٹے، تتلی کے پروں کی طرح پھڑپھڑائے اور چند ٹھنڈے آنسو اس کے دہکتے رخساروں پر لڑھک گئے۔ ہاتھوں میں بھینچے ہوئے کاغذ پر اس کی گرفت، لاشعوری طور پر مضبوط ہوتی چلی گئی۔

اس کا ہونق چہرہ دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے ٹوٹی ہوئی ٹہنی ونڈ سکرین سے نہیں ٹکرائی بلکہ کسی

مردہ ہاتھ نے اس کے ذہن کے درو دیوار ہلا دیے ہوں۔

☆☆☆

ٹھک۔۔۔۔۔۔ٹھک۔۔۔۔۔۔ٹھک۔۔۔۔۔۔وہ کتنی ہی دیر تو Mary کے اپارٹمنٹ ڈور پر دستک دیتا رہا تھا۔مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔کوئی۔۔۔۔۔۔اس کے دماغ کی نسیں اکڑنے لگیں۔

ٹرن ٹرن۔۔۔۔۔۔موبائل فون نے خاموشی کا دروازہ توڑ ڈالا۔ورنہ اس سے پہلے تو ہواؤں کی پراسرار سیٹیاں بھی ماحول میں گھٹنے سے گھبرا رہی تھیں۔

سارا دن، میوزک کا خیال آنا بھی محال تھا مگر ہاں سیل فون کی، اس جرأت کا بھی دھیان نہیں رہا تھا اسے۔

اس نے لاتعلقی سے فرنٹ ڈیسک پر پڑا فون، بائیں ہاتھ میں سنبھال کر سیدھا کانوں اور گردن کے درمیان پھنسالیا۔نمبر چیک کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی وہ جانتا تھا۔کون ہوگا۔

"اوہ، ہائے۔۔۔۔۔۔"

دوسری طرف Debby تھی۔

پھر نسوانی آواز کی ہونے والی کھسر پھسر کے دوران وہ خاموش رہا۔

Debby، حسب معمول ٹرٹرا رہی تھی۔وہ کہہ رہی تھی کہ دُکان پر رش کم ہونے کے باعث اس نے اپنے طے شدہ Beauty Treatments کی فہرست میں اضافہ کرلیا ہے اور اب وہ مزید دو، اڑھائی گھنٹے پارلر میں گزارنے کے بعد، آٹھ سے نو بجے کے درمیان اسے Tim Hortons پر مل سکے گی۔جہاں وہ ایک سہیلی کے ساتھ Coffee کے لیے جانے والی تھی۔پھر رات گئے Debby کے ہاں ہی Dinner ہوگا۔

آج Lunch کے بعد، Bill، Deborah ۔۔۔ جسے وہ پیار سے Debby پکارتا تھا، کو براڈ ویو روڈ کے ایک Beauty Parlour کی نظر کرنے کے بعد سیدھا یہیں چلا آیا تھا اور پچھلے دو تین گھنٹوں میں Debby اس کے ذہن سے اس طرح اتر چکی تھی جیسے وہ تھی ہی نہیں۔

اگر وہ فون بند کر چکا ہوتا تو اسے یہ بھی بھول جاتا کہ یہ وقت تو وعدے کے مطابق Debby کو پارلر سے Pick کرنے کا تھا۔

"Very Well, Sweet Heart!"

بمشکل یہ الفاظ کہہ ڈالنے کے بعد اس نے فون کی سانسیں گھونٹ ڈالیں۔

اس دوران وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اسے سب سے پہلے ہاتھ میں بھینچے ہوئے کاغذ کا احساس ہوا۔ اس نے فون رکھ کر دونوں ہاتھوں سے نرمی کیساتھ کاغذ پھیلا کر ہاتھ پھیرا اور سکون سے تہہ کرنے کے بعد جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

ڈرائیونگ سیٹ والی کار کی بائیں کھڑکی کھول کر اس نے سگریٹ سلگایا اور بیٹھے بیٹھے کش لگانے لگا۔ کار میں تمباکو جلنے کی بو اور دھواں پھیلتا گیا۔

ونڈ سکرین کے باہر ٹوٹی ہوئی ٹہنی، سوکھے ہاتھ کی طرح کھڑی تھی۔ جیسے دستک دے دے کر تھک چکی ہو۔۔۔ جس کے عقب میں مردہ لاش کا چہرہ تھا۔ Mary کی لاش کا چہرہ! وہ چہرہ جواب وہ شاید تمام زندگی بھلا نہیں پائے گا۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس چہرے کے نقوش اور بھی گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے مٹی پر لکھے حروف کوئی بار بار کھود کر گہرے کر رہا ہو۔ سوکھی ٹہنی کے ساتھ۔

☆☆☆

اس سے پہلے تو کبھی Mary نے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر نہیں کی تھی ورنہ اتنی دیر تو کوئی بھی کر دیا کرتا تھا۔ ایسی دیر سویر کا تو وہ عادی ہو چکا تھا۔ رات دن کے ایسے کام میں جیسے وہ Peter کا بچہ Pension ملتے ہی شراب کی بوتلوں کا ڈھیر لگا لیا کرتا اور پھر صبح اٹھنا ہی بھول جاتا۔ وہ Diana، جو خود کو Lady Diana سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ ہفتے میں دو، تین راتیں وہ Jim کے کمرے میں پائی جاتی اور بل اس کا دروازہ ہی پیٹتا رہ جاتا۔ پھر Freddy کو لے لو جو ساری ساری رات سڑکوں کے Intersections پر کھڑا، ہیٹ الٹا کر خاموش بھکاری بنا، پچیس سینٹس کی آس لگائے کھڑا رہتا پھر کسی وقت Night Patrol والوں کے ہتھے چڑھ کر صبح ہی بلڈنگ سے برآمد ہوا کرتا۔

مگر Senior Residents کی اس آٹھ، دس گھروں پر مشتمل بلڈنگز میں ایک Mary ہی تھی جو کچھ با اصول دکھائی دیتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولنے میں کبھی دیر نہیں کی اور متوقع دنوں میں وہ گھر پر ہی رہتی۔ اگرچہ اس کے ماضی کے بارے میں مختلف اقسام کی افواہیں Gulls کی طرح منڈلاتی ہی رہتیں مگر اس کی جھیل جیسی مطمئن شخصیت پر اس کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ویسے بھی اس

نے کبھی کسی آشنا کو افواہوں کا ثبوت بن کر Mary کے دروازے پر دستک دیتے نہیں دیکھا تھا۔
Bill کا کام بلڈنگ کی Maintenance اور کرایہ وصولی تھی۔
دراصل نبیل احمد، جو Mr.Bill کے نام ہی سے جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ میری سے اس کی پہلی باقاعدہ ملاقات کرایہ وصول کرنے ہی کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ورنہ اکثر دوسرے لوگوں کی طرح Mary بھی کہیں نہ کہیں، دکھائی دے جایا کرتی تھی۔ کبھی پاس کی مارکیٹ میں اور کبھی بلڈنگ کے باہر کے احاطے میں پھولوں کو پانی دیتے ہوئے۔ اس نے یہ کام خود ہی سنبھال لیا تھا، ہاں کبھی کبھی وہ اسے اپارٹمنٹ میں آنے کی دعوت ضرور دے دیتی۔ جسے قبول کرنا Bill کے لیے اتنا ہی مشکل تھا۔ جتنا ان بڈھوں کے کتوں سے جان چھڑانا۔ تقریباً ہر اپارٹمنٹ میں ایک کتا ضرور پل رہا تھا۔ سوائے میری کے۔ اور اُسے کتوں سے چڑ تھی۔ ویسے بھی "کام سے کام" رکھنے کے اصول نے اسے بہت سے مواقع پر خوش خلقی اور ہمدردی دکھانے سے "بچا" رکھا تھا اور جھٹ پٹ Personal ہو جانے کا رواج، مغرب کی تہذیب میں نہیں تھا۔
اس روز Mary کے اپارٹمنٹ میں کچن کے Sink والا نلکا Fix کرنے کے بعد وہ چپ چاپ نکلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے Mary کی پیشکش ہوئی۔

"Mr.Bill, Coffee.....Beer!!"

☆☆☆

ایک روز وہ پھنس ہی جائے گا۔ خطرہ اسے پہلے ہی تھا۔ اس لیے اس نے اِن بڈھوں کے منہ لگنے کی کوشش ہی نہیں تھی۔ اسے ماضی کی یادگاروں جیسے بوسیدہ بوڑھوں کی تاریخ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جنھوں نے زندگی کی امیدیں قائم رکھنے کے لیے طرح طرح کی سرگرمیاں اپنا رکھی تھیں۔ جن میں سب سے عجیب ترین تھا سالگرہ منانا! کچھ تو سال میں کئی کئی بار اپنے برتھ ڈیز Announce کر ڈالتے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کو اپنے ماں باپ کا نام اور اتہ پتہ بھی یاد نہیں تھا۔
میری، اگرچہ انہی میں سے ایک تھی، مگر وہ ان جیسی بالکل نہیں تھی۔ اس کی عمر ساٹھ کا ہندسہ ضرور پھلانگ چکی تھی مگر وہ سٹھیائی ہوئی نہیں تھی۔ شاید اسی لیے سالگرہ بھی نہیں مناتی تھی۔
میری کے لباس کی وضع قطع، اس کے رنگوں کا انتخاب، بالوں کا سٹائل، ہیٹ اور جوتوں کی بناوٹ اگر کوئی پشت سے دیکھ لیتا تو آگے جا کر مڑ کر دیکھنے کی خواہش ضرور کرتا۔ اگرچہ مڑ کر دیکھ لینے

کے بعد، میک اپ کے پردے کی اوٹ سے جھانکتا اصل چہرہ فوراً عمر کی چغلی کھانے لگتا مگر یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ اپنے قد و قامت اور بناوٹ کے باعث اب بھی نظروں کو بھا جانے والی "دلکش چیز" تھی۔

اس دلکش "چیز" کے اندر ایک خوبصورت شخصیت بھی چھپی تھی اس کا اندازہ اسے اس روز ہی ہوا جب اس نے Coffee کی دعوت کو قبول کرلیا۔ اسے Beer کہنے میں کچھ خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے کچھ دیر کے لیے اپنی Reputation کا خیال اس کے ذہن سے اتر گیا تھا۔ اس لیے وہ میری کے کہنے پر سرخ رنگ کے ایک صوفے، جو غالباً Love-Seat تھا میں دھنس گیا۔

میری کے کافی بنانے تک وہ لاتعلقی سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ کمرے کی آرائش، اگرچہ Old-Fashion اور بوسیدہ تھی۔ مگر اس میں نفاست کا Touch نمایاں تھا۔ کروشئے کی میز پوش اور صوفہ بیکس، Linen کے پردے اور کارپٹ، کینڈل سٹینڈ اور ٹیبل لیمپ، پینٹنگز اور کتابیں اس سجاوٹ کے لحاظ سے کوئی خاص ہم آہنگی تو دکھائی نہیں دیتی تھی اور پہلی نظر میں پورا کمرہ کسی Thrift Store ہی کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ مگر یہ کہنا بھی غلط نہیں تھا کہ ماحول پر اچھے فیملی بیک گراؤنڈ کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔

کمرے میں سب سے عجیب چیز جو Bill کے ذہن میں خواہ مخواہ کی تشویش پیدا کر رہی تھی، وہ تھی، میز کے لیمپ کے پاس دھری بائبل۔ جس کے قریب ہی ایک پرانا آئینہ بھی اس طرح موجود تھا جیسے کتاب کا رشتہ دار ہو۔ پتہ نہیں اسے کیوں گمان گزرا کہ نہ صرف آئینہ ہی دیکھا جارہا تھا بلکہ بائبل بھی بار بار پڑھی جاتی تھی۔ اس نے اس خیال سے نظریں چرا کر عین اوپر نگاہ گھمائی تو مقدس میری کی مسکراتی تصویر نے خیال کی تصدیق میں سر ہلا دیا اور مقدس میری کی گود میں بیٹھے ننھے بچے نے کلکاری لی "Son of Man" کی سی کلکاری!

"Coffee!"۔ Mary نے گھبرائے ہوئے Bill کے ہاتھ میں کافی کا گرم گرم مگ تھما دیا اور خود پاس پڑی Rocking Chair میں جکڑ گئی۔

"تم یہاں کب سے ہو Bill؟" میری کا لہجہ British تھا۔ چر چر ساتھ ہی ساتھ راکنگ چیئر بڑبڑا رہی تھی۔

"تقریباً چودہ، پندرہ سال سے" Bill کا جواب مختصر تھا۔

اور وہ ان سالوں کی کارستانیاں سنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"تمہارے والدین، بھائی بہن، میرا مطلب ہے------" میری نے بات بڑھائی۔
"یہاں کوئی نہیں ہے۔ والدین تو خیر دنیا ہی میں نہیں ہیں۔ لیکن ایک بھائی اور بہن ہیں۔ وطن میں۔ میرا مطلب ہے، Back Home!"

Bill کا لہجہ بھی ویسی کا ویسی تھا۔ البتہ زبان انگریزی ہو گئی تھی۔

"اور تم------"

"میں کیا!------تمہارے سامنے ہوں" وہ کیسی تفصیل میں جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر ابھی کافی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ کچھ اور معلومات دینے کے لیے بولا۔

"بہن کی شادی کر دینے کے بعد والدین حج پر سے واپسی پر شہید ہو گئے تھے اور---

So tragic.........میری کی آواز سنے بغیر وہ بولتا رہا------

"بڑے بھائی نے والد صاحب کا کاروبار بھی سنبھالا اور مجھے بھی ------مگر میں Graduation کے بعد۔ اپنا حصہ جائیداد بیچ کر یہاں چلا آیا------اور بس تب سے یہیں ہوں تمہارے سامنے ------ایک آدھ بار Back home کا چکر بھی لگا آیا ہوں------ہم سب خوش ہیں۔ اپنی اپنی جگہ------اور بس------

"او کے میں چلتا ہوں۔ کافی کام ہے------

And Thanks for the Coffee Anyways!

Mary نے------Rocking Chair پر بیٹھے بیٹھے اسے خیر باد کہہ دیا۔

Mary کے کمرے سے بظاہر "جان چھڑا" لینے کے بعد، اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ پھر وہ وہاں کبھی نہیں جائے گا۔ مگر پتہ نہیں اسے کیوں لگتا رہا کہ وہ اپنا کچھ بھول آیا تھا، کمرے میں! اس شام Mary کی Rocking Chair دیر تک اس کے خیال سے باتیں کرتی رہی۔

جو------جو------Mystorious طریق سے۔

☆☆☆

پھر ایک روز شاپنگ کے دوران، میری نے Bill اور Debby کو ایک ساتھ دیکھ لیا تو مجبوراً تعارف کروانا پڑا۔ میری نے روایتی خوش خلقی کے ساتھ اپارٹمنٹ میں آنے کی دعوت دی تھی جسے آسانی سے Ignore کیا جا سکتا تھا مگر Debby، Bill کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ وہ میری کے بار

ے میں اڑتی افواہوں کی تصدیق کے لیے ملے، ایسے موقع کو کیونکر ہاتھ سے جانے دیتی! مگر Bill تو ایسی باتوں میں least Interested تھا۔ اس لیے ایک روز Debby کو میری کے اپارٹمنٹ میں چھوڑنے کے بعد وہ مصروفیت کا بہانہ کر کے فرار ہو گیا۔

پھر تقریباً دو، اڑھائی گھنٹے بعد ہی، کار کی اگلی سیٹ پر Bill کے ساتھ بیٹھی، Debby، میری کا تماشہ بناتی رہی۔ وہ قابل اعتراض گفتگو کے نشتر سے Mary کا Post Martum کرتی رہی اور لالی پاپ کی طرح اپنی ہی باتوں کا مزہ لیتی رہی مگر Bill بظاہر بہرہ بننے کی کوشش کرنے کے باوجود ہی سیٹ میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ یہ شکر تھا کہ ڈرائیونگ کے باعث وہ Debby کا چہرہ دیکھنے پر مجبور نہیں تھا۔ ورنہ ضرور ہی Debby کو اس کی بے چینی کا اندازہ ہو جاتا۔

اس لمحے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ڈیبی کو اٹھا کر باہر پھینک دے جب اس نے یہ بات کر کے اپنا Lolly pop چبا لیا۔

She is Just a Doll! You See Darling...Old Barbie Boll...Completely Artificial!

اس میں، کوئی Genuine وجہ بھی تھی یا صرف Debby کی باتوں کا ردعمل کہ Bill نے چاہا کہ وہ کسی طرح Mary کو بچا لے۔

احتجاجی طور پر وہ ہفتہ بھر Debby سے نہیں ملا۔ Building کے لوگوں کو بھی یہی پتہ تھا کہ وہ شہر سے باہر کسی اور مقام پر واقع بلڈنگز کی Maintenance کے لیے گیا ہوا ہے۔

مگر پورا ہفتہ اس نے ادھر ادھر کی جھک مارنے اور سڑکیں ماپنے میں گزار دیا۔ ویسے بھی دن کے، دس بارہ گھنٹے کار کے اندر ہی گزارہ کرتا تھا۔ پورے شہر میں کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ سب جگہیں بھی ایک سی دکھائی دیتی تھیں۔ اسے یوں لگتا جیسے دائرے میں گھوم رہا ہو۔ اسے لگ رہا تھا شہر کی یکسانیت میں اس کی روح کا دم بھی گھٹ رہا ہے۔

ڈیبی کی باتوں کے پتھر بار بار اس کے دماغ کی سطح پر ہم مرکز دائروں کی لہریں بنا رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا، ایک سی عمارتوں سے بھرے پتھر کے شہروں پتھریلی سڑکوں کے کنارے، جگمگاتی مصنوعی روشنیوں کے ہجوم میں، جگہ جگہ اشارے کرتی گڑیوں جیسی عورتیں اور لڑکیاں-----میریاں ہیں-----عورت کی ذات پر دی جانے والی کوئی گندی

گالیاں ۔۔۔۔۔۔ یا نہیں "پہلے پہلے پتھر" مارتی ہوئی ڈبیاں!

ایسے ہی Depression میں ایک روز Bill نے کافی عرصہ کے بعد اپنی قریبی پسندیدہ Bar کا رخ کیا۔ جہاں وہ کچھ عرصہ قبل تو با قاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ مگر جب رفتہ رفتہ پاس کے سٹور پر ملازم Debby سے تعلقات بڑھے تو وہ زیادہ تر Debby کے اپارٹمنٹ میں پایا جانے لگا تھا۔

بار کاؤنٹر پر Mike نے روایتی خوش دلی سے Bill کو خوش آمدید کہا۔ مگر وہ شراب سے زیادہ باتوں میں مشغول تھا اور لاشعوری طور پر Mary میں ۔۔۔۔۔۔ جب Mary کا ذکر چل ہی نکلا تو پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ وہ بھی Talk of the Town تھی۔

Mike "You Mean...Mary Holmes?" نے پہیلی بوجھ کر کہا۔

پتہ نہیں ۔۔۔۔۔۔ وہ صرف Mary ہی نام سے جانی جاتی ہے۔

"اصل میں تو وہ Mary Williams ہے ۔۔۔۔۔۔ او کے او کے ۔۔۔۔۔۔ کافی عرصہ تک ان کا فیملی پر ابلم اخبار کے فرنٹ پیج پر سجا رہا تھا۔

میری کا باپ ایک مخیر کرسچین تھا اور ماں جاپانی تھی۔ غالباً Budhist!" University Class mate کی Love Maraige کا قصہ تھا" Bill

Bill سننا چاہ رہا تھا ۔۔۔۔۔۔ "ہونہہ ۔۔۔۔۔۔ یا ۔۔۔۔۔۔"

مائیک نے بات جاری رکھی۔ "۔۔۔۔۔۔ مگر یہاں کی عام سی کہانی کی طرح چند برسوں ہی میں ان کا Break-up ہو گیا۔ یہ بہت افسوس ناک بات تھی کہ میری کی ماں نے خودکشی کر لی تھی اور باپ نے دوسری شادی۔ بس پھر Broken Homes کی عام سی کہانی کی طرح میری High School میں ہی باپ کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔

"You know Bad Company .....Drugs....etc"

وہ Jenny, Jennifer جو Mary کو قریب سے جانتی تھی، ہمارے ہاں ملازمت بھی کرتی رہی۔ اسی نے بتایا تھا کہ خود کو اپنے ہی ہاتھوں ضائع کرتی ہوئی میری کی زندگی میں Andrew William یوں تو قدردان بن کر آیا گیا مگر اس کے ہاتھ میں تھامے ہوئے Wedding Invitation Card کے پیچھے Murder لکھا تھا۔ You know!

Andy کا تعلق کچھ غلط قسم کے Movie Director کے ساتھ تھا۔اس لیے اس نے میری کا خوبصورت جسم Cash کرنے کے لیے اسے ایکٹریس بننے کا لالچ دیا۔میری کے لیے Andy شاید پہلا اور آخری انسان تھا جس پر اسے آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر لیا تھا۔اس نے میری کی روح اور جسم کھلونا بنا ڈالا اور وہ بنتی گئی۔اپنے جسم کو مزید دلکش بنانے کے لیے Andy کے کہنے پر اس نے ہر معنوی طریقے کا رسک لیا۔مگر اصل ظلم تو یہ تھا کہ اس نے اپنے پہلے بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی اپنے پر قربان کر دیا۔۔۔۔۔۔پھر پتہ نہیں کسی پیچیدگیاں ہو گئیں یا گاڈ نے Punish کر دیا۔کہ وہ تو اس صلاحیت ہی سے محروم ہو گئی۔۔۔۔۔۔! You know Hysteractomy۔۔۔۔۔۔مگر بے چارگی اور ظلم کی کہانی وہیں ختم نہیں ہوئی۔ Mary کی Value کم ہوتی دیکھ کر ایک روز Andy کا بچہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔

پھر کچھ عرصہ کے لیے میری بھی دنیا سے غائب ہو گئی شاید! مگر جب دوبارہ دکھائی دینے لگی تو سمجھو اس کا اگلا جنم ہی تھا۔اس کے بعد سے اس نے شاید کسی مرد کو منہ نہیں لگایا۔وہ Sick-kids ہسپتال میں بیمار بچوں کے پاس نظر آتی یا کبھی کبھی Church میں ۔۔۔۔۔۔پہلے Volunteer کرتی رہی۔۔۔۔۔۔پھر اسے ملازمت دے دی گئی اور اپنی ریٹائرمنٹ تک وہ ہسپتال میں ہی وقف ہو گئی تھی۔سنا تھا جس دوران وہ غائب تھی حکومت کی طرف سے اس کی Therapy کی گئی تھی۔ورنہ شاید وہ بھی ماں کی طرح۔۔۔۔۔۔

خیر سنا ہے اب وہ کہیں سینئرز کی بلڈنگ میں رہتی ہیں۔

''ہوں۔۔۔۔۔۔ہاں ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے۔۔۔۔۔۔''

''او کے میں چلتا ہوں مائیک۔۔۔۔۔۔سی یو! وہ Bar سے باہر نکلا تو مکمل ہوش میں تھا۔

آج تمام رستہ وہ گاڑی کے باہر اس طرح تاک رہا تھا جیسے اس کی روح جسم سے باہر جھانک رہی ہو۔۔۔۔۔۔

پتہ نہیں۔اسے کیوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سامنے کی سکرین پر فلم کی طرح چلتی ہوئی دنیا میں کہیں Belong نہیں کرتا۔اچھا، برا Background ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔وہ تو خود بھی Orthodox مسلمان تھا اور جہاں سے وہ آیا تھا وہ ملک بھی مسلمانوں ہی کا تھا۔یہاں کے لوگ Profession کے طور پر نہ لیں مگر ایسی ہی سرگرمیوں میں مصروف نظر آتے تھے۔جو

مذہبی طور پر ممنوع تھیں مگر وہاں!------

یہ دنیا Debby جیسی تھی۔لوگ دوسروں میں برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مزے لیتے ہیں اور اپنی شکل آئینے میں نہیں دیکھتے۔اپنا گریبان نہیں جھانکتے۔

اچانک Bill نے Mirror میں جھانکا اس کی دائیں ابرو کے کنارے پر ایک چاندی کا "کوکا" کھبا ہوا تھا۔جو Debby کے کہنے پر------اس نے شیشہ گھما دیا اور سٹیرنگ اندرون شہر کی طرف موڑ دی۔اس کی کلائی پر حرف "D" کا Tatoo کھدا ہوا تھا۔اُس نے کب سوچا تھا کہ کوکے، بالیوں سے یا مہندی اور چوڑیوں کا کوئی ایسا ویسا مطلب بھی نکلتا ہوگا!

رات کے اس پہر سڑکوں کے چوراہوں پر بتیوں کی طرح اشارے کرتی گڑیاں کھڑی تھیں سب کی سب ڈیبیاں------لگ رہی تھیں۔

اگر مرد یہ شغل اپنائے دکھائی دیتے تو سب کے سب------Bill لگ رہے ہوتے اس نے چڑ سوچا۔

کچھ عرصہ بعد اپنے کام کے سلسلے میں اسی بلڈنگ کی طرف آیا تو معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ سے میری کی طبیعت ناساز تھی۔

وہ سیدھا میری کے اپارٹمنٹ ڈور کے باہر جا کھڑا ہوا۔حسب معمول تین چار دفعہ کی دستک کے بعد میری دروازہ کھول دیا۔وہ واقعی بیمار لگ رہی تھی۔Bill چپ چاپ، بن بلائے ہی اندر داخل ہو گیا۔

"Coffee......!" میری نے پیش کش کی۔

"No Thanks"------Bill نے شائستگی سے جواب دیا۔سہارا لے کر میری، راکنگ چیئر------میں جکڑی گئی اور چیئر باتیں کرنے لگی------چ------چ------چ------چ------

ٹیبل پر پڑے بوتل اور گلاس اس بات کے گواہ تھے کہ میری Upset تھی۔

شاید اس روز Debby نے زیادہ ہی کریدلیا ہو۔زخم رستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

ٹیبل کی چیزوں میں چند پرانی تصویروں کا اضافہ تھا۔میری نے سب کا تعارف کروایا۔ Andrew Williams کا بھی۔

Bill نے بھی دلجوئی کی خاطر کچھ سوچتے ہوئے، اپنے والٹ سے چند تصویریں نکال کر میری

کے ہاتھ میں تھمادیں جس میں بسنے والے، پچھلے جنم کا حصہ لگ رہے تھے۔

وہ کافی دیر ------امی جان کی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ روایتی سی ماں------سر پر اوڑھنی سے ڈھکے کھچڑی بالوں کی جھلک------چہرے پر ہلکی جھریوں کے بیچ پھیلی ہوئی مسکراہٹ------اور پوری تصویر پر چھایا ہوا------تقدس!

"Your Mummy .... Haan......So Simple!"

"Bill You Belong to a Simple Culture!" What a luck!"

میری نے Comments دیئے۔

"Ya, Yaah!..... Bill نے کھنگارتے ہوئے نکالا! اور کچھ دیر کے لیے اس کے دماغ کی سکرین پر طرح طرح کی ماؤں کی تصویریں گھومنے لگیں۔ جنہیں جوان اور پرکشش بننے کے لیے ہر طرح کے مصنوعی سہارے لینے کے خبط نے، ممتا سے دور کردیا------اسے یاد آیا کہ پراندے پہننے والی بہن نے ایک روز نقلی چٹیا میں بال گوندھنے کی کوشش کی تھی تو امی جان نے کسی حدیث کا فرمان------چپت کی طرح باجی کے سر پر لگادیا تھا۔ پھر باجی نے شادی پر بھی نقلی ناخن اور پلکیں استعمال نہیں کیں۔

میری کی نظر باجی کے بچپن پر جمی ہوئی تھیں۔ "Your Sister....!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا------باجی کی گود میں کپڑے کی گڑیا تھی۔

میری کچھ پرجوش سی ہو کر راکنگ چیئر سے اٹھی اور بیڈروم میں چلی گئی۔

کچھ لمحوں کے لیے لونگ روم کی فضا میں ------چ------چ------چ------چ--چھاگ ءی۔ بیڈروم سے، کچھ چیزوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنے لگیں۔

یکدم میری کچھ ایسے حلیے میں برآمد ہوئی جیسے پرانے صندوق سے کپڑے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کپڑے کی گڑیا تھی۔

"This Rag Doll....!"

"------یہ میری ماں نے مجھے دی تھی۔ وہ اپنے بیک ہوم سے لائی تھی۔"

Bill نے میری کا دل رکھنے کے لیے گڑیا کو ہاتھ میں تھام لیا------!

کپڑے کی گڑیا کے نقوش جاپانی طرز پر کڑھے ہوئے تھے۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ

میری کے چہرے میں جاپانی نقوش کی آمیزش تھی۔ گڑیا کے بال، کالے اور سیدھے تھے ـــــــ اور میری کے Blonde! اس نے سوچا کچھ عرصہ تو بالوں کو سنہری کرنے کا فیشن، مشرق اور مغرب دونوں ہی اطراف میں یکساں پھیلا ہوا تھا۔

البتہ گڑیا کے کپڑے، جاپانی نہیں، ویسٹرن سٹائل کے تھے۔

"Very cute...!" ـــــــ Bill نے خوش دلی دکھا کر گڑیا میری کو واپس پکڑا دی اور میری نے اسے ٹیبل کے کونے میں بٹھا دیا۔

"Actually میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے تمہاری طبیعت اچھی طرح معلوم نہیں ہو رہی۔"

You Should See Your Doctor!

"او ـــــــ نو ـــــــ نو ـــــــ" میری زبردستی مسکرائی.

"Do You Believe in Incarnation Mr.Bill? ـــــــ

میری نے شاید بات بدلنے کی کوشش کی۔

Bill جو Religion سے کوسوں دور کھڑا تھا، بازگشت سن کر یک دم دوڑا۔

Well، اسلام میں تو ایسی کوئی Belief نہیں ہے۔ البتہ کچھ اور مذاہب میں اس قسم کا عقیدہ ضرور موجود ہے ـــــــ غالباً نئے جنم سے تعلق ہے اس کا! ـــــــ !!

Bill نے اپنی لاعلمی چھپاتے ہوئے، احتیاطاً جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جیسے Budhism ـــــــ میں۔ مگر میری ماں کا تعلق Shinto مذہب سے تھا۔ جو جاپان کا اصل Native Religion ہے۔ اب تو اس میں کافی حد تک Budhism ہی کی ملاوٹ ہو چکی ہے۔ مگر مجھے Shinto مذہب میں سب سے اچھی بات پتہ کون سی لگتی ہے۔"

Bill کو یہ جاننے کی کوئی خواہش تھی نہ ضرورت۔ مگر وہ اس روز میری کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"کونسی" ـــــــ وہ پھر کھانسا۔

دوسرے مذاہب کی طرح Shinto مذہب میں کوئی Absolute right یا Wrong کا عقیدہ نہیں ہے۔ جس کی بنیاد صرف اتنی ہے کہ ہمارے ضمیر میں Goodness کا مادہ موجود ہے اور اسی لیے یہاں دوسرے مذاہب کی طرح After life کا تصور زیادہ اہمیت

Incarnation یہ نہیں رکھتا بلکہ اس دنیا میں Fitness حاصل کرنا زیادہ اہم ہے تو پھر یہ Recycling کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ البتہ وہ بھی Funerals، بدھسٹ ہی کی طرح کرنے لگے ہیں۔ I Mean,....Incremation مردے کو جلا کر سمجھتے ہیں خلاصی ہوگئی۔۔۔۔۔۔وہ مسکرانے لگی اور Bill کی کسمساہٹ بھانپ کر فوراً بولی، "تم بور تو نہیں ہور ہے مسٹر بل!"

نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔"میرے خیال میں مکت ہو جانے کے لیے اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔۔" وہ کھسیانے پن میں کہہ گیا۔

"اور تمہیں پتہ ہے۔ مسٹر بل۔۔۔۔۔۔یہ Christianity میں جو Word of God مقدس میری کے جسم میں پھونکنے کا عقیدہ ہے ناں، وہ بھی Incarnation ہی پر Based ہے۔

"اچھا؟" تم کافی Religious ہو میری۔۔۔۔۔۔" Bill نے میری کی حوصلہ افزائی کی۔

"اوہ! Bill۔۔۔۔۔۔" اس کی آنکھوں میں نمی سی آنے لگی۔۔۔۔۔۔

"Forget It۔۔۔۔۔۔" وہ بمشکل بول پائی۔

Bill کے ذہن پر اپنے دیس کے سکولوں میں Christmas کے دنوں میں کئے جانے والے، Christmas Shows چھانے لگے۔

اگر یہ تمام لوگ کم از کم اپنے مذہب کی روح کو اپنا سکیں تو یہ دُنیا مختلف ہو جائے۔ ورنہ برائی سے مکتی کا کوئی طریقہ کارگر نہیں ہوسکتا۔

"میں چلتا ہوں Mrs.Williams"۔ اس کے منہ سے اچانک نکل گیا۔۔۔۔۔۔وہ Bill کا منہ تکنے لگی۔۔۔۔۔۔اور فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لینے کے بعد وہ اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

دروازہ کے پاس پہنچ کر" Bill نے پلٹ کر بڑی خوش دلی سے جب "Take care" کہنے کے بعد میری کا چہرہ دیکھا تو وہ اپنے آپ کو بمشکل روک پایا۔

میری اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے، بائیں ہاتھ میں پہنی Wedding Ring تیزی سے گھما رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ میری کو بڑھ کر گلے سے لگا لے۔

مگر بڑی بے رحمی سے، وہ میری کی حسرت، اس کی نمدار آنکھوں میں چھوڑ کر چل دیا، اسے کیا معلوم تھا وہ میری سے اس کی آخری ملاقات تھی۔

☆☆☆

کار میں سگریٹ کے دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ Bill کا تمام جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس کا دم گھٹنے ہی کو تھا۔ اس نے بے چین ہو کر کار کا دروازہ دھکیلا اور باہر نکل آیا۔ کار لاک کیے بغیر ہی وہ جھیل کو تکتے ایک بنچ پر جا بیٹھا۔

جھیل کے خاموش پانی پر شام کا اندھیرا بچھنے والا تھا۔ مگر Bill کے دماغ میں اب بھی سمندر کی لہروں کا سا شور تھا۔

☆☆☆

پرسوں، 11 نومبر، شام کے وقت جب میری کا دروازہ ڈھیٹ بنا کھڑا تھا جس پر پیٹنے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اردگرد کے لوگوں کے آرام کا خیال کرتے ہوئے اس نے کمر پر کسے، چابیوں کے گچھے میں سے میری کے اپارٹمنٹ کی زائد چابی نکالی اور آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں لیمپ کی روشنی اور کچھ نامانوس سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

Mary، Rocking Chair میں جکڑی ہوئی تھی۔ مگر کرسی خاموش تھی۔ غالباً میری سو رہی تھی۔ یا شاید زیادہ پی کر بے ہوش تھی۔ کیونکہ بوتل اور گلاس خالی تھے۔

ٹیبل پر پڑی چیزیں غیر معمولی طور پر بے ترتیب دکھائی دے رہی ہیں۔ آئینہ کچھ زیادہ ہی قریب پڑا تھا۔ بالکل میز کے کنارے کہ ابھی گرا کہ ابھی گرا۔ Bill نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ٹیبل پر دوا کی گولیوں کے خالی پتے پھیلے ہوئے تھے۔ جو لیمپ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ کچھ پتے ٹیبل کے نیچے، چیئر کے آس پاس بھی تھے۔ غالباً میری نے ڈاکٹر سے کوئی Prescription لے لیا تھا۔

لیمپ کی روشنی میں میری کا چہرہ صدیوں پرانا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چپکے ہوئے رنگ، چہرے سے الگ نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک ایسی Painting دکھائی دے رہی تھی جو "Crack" ہو چکی تھی۔ اس لیے کہ اس کے نیچے کی لطیف سطح اوپر پھیلی ہوئی دبیز تہہ کو سہار نہیں

سکی تھی۔'' وہ ایسا شہر دکھائی رہی تھی جسے زلزلے نے تہس نہس کر دیا ہو اور کہیں کہیں اس شہر کی نشانیاں، اساطیر الاولین کی طرح عبرت کا نشان بنی کھڑی ہوں۔

اس نے کچھ سوچ کر اپنے ہاتھ کی پشت میری کے ماتھے سے لگا دی۔

وہ برف ہو چکی تھی ------ میری مر چکی تھی۔

ایک جھٹکے سے Bill نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ جھٹکے کی وجہ سے میری کے سر پر لگی سنہرے بالوں کی Wig سرک کر نیچے جا پڑی اور میری کا Bald سر، ناریل کی طرح باہر نکل آیا۔ Bill گھبرا کر پیچھے ہٹا اور صوفے میں جا دھنسا۔

کتنی ہی دیر وہ اسی طرح صوفے میں دھنسا رہا جیسے صوفہ نہیں دلدل ہو۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی اس سے باہر نہ نکل پا رہا ہو۔

وہ کسی لاش کی طرح میری کی لاش کو ایک ٹک تکے جا رہا تھا۔ میری کے چہرے کے نقلی رنگ، اب بھی تازہ لگ رہے تھے۔ اس کے سینے میں بھرا ہوا سیلیکان جیل (Silicon Gel) ابدی تھا۔ مگر میری کے دونوں ہاتھوں کے نیچے دبی ہوئی اس کی گود خالی تھی!!

جب اسے ہوش آیا تو سب سے پہلے اسے 911 ہی کا خیال آیا مگر وہ جانتا تھا کہ ٹیلی فون پر تین بار انگلیاں چلانے کے بعد شاید تین دنوں یا تین مہینوں یا شاید تین سالوں سے بھی زیادہ لمبی کارروائیاں چل نکلیں گی۔

کیونکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ میری نے خودکشی کی تھی۔ اپنی روحانی اذیت کم کرنے کے لیے اس دوا کی Overdose لے لی تھی۔ مگر یوں لگ رہا تھا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی روح Bleed کر رہی ہو۔

اچانک Bill کی نظر میز کے اوپر، دیوار پر لگی مقدس میری کی تصویر پر جا پڑی۔ جسے لیمپ کے اوپر سے نکلنے والی شعاعوں نے جگمگا رکھا تھا۔ مقدس میری کے سر پر ''ہالہ'' تھا اور پوری تصویر پر ''تقدس'' پھیلا تھا۔ یکدم کسی معجزے کی طرح تصویر کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہنے لگے اور ننھے منے بچے کے رخساروں پر پھیل گئے۔

اسے لگا، راکنگ چیئر میں جکڑی ہوئی میری ------ سزائے موت دی جانے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی گناہ گار عورت نہیں ------ بلکہ توبہ کی روشنی سے منور کوئی پاکیزہ روح تھی۔ جس کے

ناریل جیسے گنجے سر کے اردگرد نور کا ہالہ تھا۔اور اب وہ کسی کے پتھر سے ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔

Bill اٹھ کر ٹیبل پر پڑی چیزیں ٹٹولنے لگا۔سب سے پہلے اس کی نظر۔۔۔۔۔۔بائبل پر پڑی جو کسی عام کتاب کی طرح پیٹ کے بل الٹی دھری تھی۔اس نے احتیاط سے بائبل کو درمیان سے سنبھالتے ہوئے سیدھا کیا۔

لوقا کی انجیل کا ابتدائی Chapter کھلا ہوا تھا جہاں،حضرت جبرائیلؑ،حضرت مریمؑ کے لیے"کلام اللہ""کی خوشخبری لاتے ہیں۔

نیچے دو سفید کاغذ،خط کی طرح،تہہ شدہ پڑے دکھائی دیئے۔جن میں سے ایک Police Department کے لیے تھا جس میں میری نے اپنی خودکشی کا اعتراف کیا تھا اور ایک اپیل کی تھی۔۔۔۔۔۔"میرا جسم۔۔۔۔۔۔میری روح پر بوجھ تھا۔ برائے مہربانی اسے Incremate کر دیا جائے،شاید اس طرح میری مکتی ہو سکے۔"

دوسرا خط Bill کے نام تھا۔

"پیارے بل،پتہ نہیں کیوں مگر تمہارے روپ میں مجھے خدا نے ایک بیٹا عطا کیا ہے، Christmas کا تحفہ۔میں نے ہمیشہ تمہاری عزت کی۔امید ہے تم بھی اپنی ماں کی آخری خواہش کا احترام کرو گے اور اپنے ہاتھوں سے میری راکھ کو جھیل اونٹاریوں کی رگوں میں انڈیل دو گے۔"

اتنا پڑھ کر Bill بچوں کی طرح ڈھاریں مار مار کر روتا رہا۔

مگر وہاں اسے چپ کروانے والا کوئی نہیں تھا۔سسکیاں،اپنے آپ ہی کم ہوئیں تو اس نے باقی کے الفاظ پڑھنے شروع کیے۔

"Bill، 13 نومبر کا منحوس دن میری سالگرہ کا دن ہے۔

مکت ہونے کے لیے اس سے اچھا دن تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اب تمہیں معلوم ہو گیا ناں کہ میں سالگرہ کیوں نہیں مناتی تھی۔"

اسے یاد آیا کہ مغرب والے Numerology کے طلسم میں اتنے مبہوت ہیں کہ Elevator اور اپارٹمنٹ کے نمبروں،میں بھی 13 کا ہندسہ حذف کر دیتے ہیں آج اسے احساس ہوا تھا کہ ایسے بے بنیاد عقائد کس طرح زندگیوں کو تلخ بنا دیتے ہیں۔

وہ آگے پڑھنے لگا۔"Bill میں نے تمہیں کبھی کوئی تحفہ نہیں دیا۔اگر قبول کرو تو میز کے کونے

میں پڑی میری Rag Doll نشانی کے طور پر رکھ لو۔ میں سمجھوں گی تم نے، مجھے یاد رکھا۔"

فقط، میری ولیمز۔

پھر Bill نے کیا کیا، سب کچھ کیسے نمٹایا، کوئی نہیں جانتا۔

☆☆☆

سردی اور اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔

یکدم Bill کو احساس ہوا کہ وہ پاگلوں کی طرح اکیلا بیٹھا کسی ٹی وی کی آف، سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جھیل کی جانب چل دیا۔ اس نے بڑھ کر جیب سے تہہ شدہ کاغذ نکالا۔ اسے آخری بار پڑھا اور ہاتھ میں پکڑ کر لائٹر سے اس کا کونہ جلا ڈالا۔

یکدم ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور تمام راکھ اڑا کر لے گیا اور جھیل کی سطح پر بچھا گیا۔ جہاں آج صبح۔۔۔

بل نے کچھ سوچ کر ابرو کے کوکے کو کھینچ کر اکھاڑ ڈالا۔ اگر چہ اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ کچھ ہلکا محسوس کرنے لگا۔ اب اسے Debby کے شانوں پر رونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے جذبات کبھی ڈیبی پر ظاہر نہیں کرے گا۔ کبھی کوئی اپنی ماں کی عزت بھی کسی کے حوالے کر سکتا ہے وہ اندر سے اب بھی اتنا ہی Orthodox تھا، اتنا ہی مشرقی۔۔۔!

اس نے کار سٹارٹ کی اور براڈویو روڈ کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں میپل اور اوک کے پتے، گناہوں کی طرح جھڑے ہوئے پڑے تھے۔ کہیں کہیں گھروں کے باہر کی کیاریوں میں نقلی پھول، اسی طرح جوان دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں خاک میں مل جانے کا ڈر نہیں تھا۔ وہ Bio Degradable نہیں تھے۔ سدا بہار ہے!

کچھ جلد بازوں نے کرسمس لائٹس ابھی سے لگا رکھی تھیں۔ کار کی ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر اس کے ہم راہ، ایک کپڑے کی گڑیا آرام سے بیٹھی تھی۔

گڑیا کے سر پر سفید موتیوں سے بنا ایک رنگ نما تاج تھا۔

پکوڑے

پکوڑے۔۔۔۔۔پکوڑے۔۔۔۔۔پکوڑے۔۔۔۔۔!!!

اچانک ملی جلی آوازوں کا ریلہ کچن کی کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔ایسے ہی ریلے میں بہہ کر میں آخرکار باورچی خانے میں آ پہنچی تھی اور نا جانے کتنی دیر سے کھڑی ہوش میں آنے اور پکوڑے بنانے کی کوشش میں تھی۔

میں کوئی پہلی بار تو پکوڑے نہیں بنا رہی تھی مگر لگ تو یہی رہا تھا کہ پہلی بار ہی بنا رہی ہوں۔قسم سے بالکل اناڑی لگ رہی تھی۔

میں نے ڈھیلے ہاتھوں سے بیسن گھولنا شروع کر رکھا تھا۔مگر موا دھیان ہی نہ تھا پکوڑوں میں۔آمیزہ بنتا تو پکوڑے بھی تلے جاتے۔مگر آمیزہ تھا کہ بننے ہی کو نہیں آ رہا تھا۔

اب پوچھو تو پکوڑوں کی بھی کوئی خاص ترکیب تھوڑا ہی ہوتی ہے! تھوڑا یہ ڈالا اور تھوڑا وہ ۔۔۔۔۔اوپر سے چچہ بھر مصالحوں کا۔۔۔۔۔اور آ گیا بیسن کے ذائقے میں نکھار۔

پر میں کیا کرتی کہ غصے میں کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا،دماغ تھا کہ تیل کی طرح کھول رہا تھا۔ارے کچھ بنے تو اسی تیل میں نہ جھونک دوں۔قسم سے تڑک تڑک ہو رہی ہے۔

ویسے تو یہ کچن آج کسی پناہ گاہ سے کم نہیں۔لیکن کیا کروں پکوڑوں کے علاوہ یہاں ٹکے رہنے کا کوئی اور جواز بھی نہیں۔

کاش پکوڑا مکس کا ڈبہ ہی ہاتھ لگ جاتا۔مگر کون جائے گا مارکیٹ۔۔۔۔۔۔میرے کہنے پر! فاطمہ بی۔کبھی آ جاتی تھی تو اکا دکا کام ہی نمٹ جاتے تھے۔مگر اب تھوڑا ہی گھسے گی وہ اس گھر میں۔ایک تو سب رشتے نمٹ گئے ہیں تو سمجھو کہ دانہ پانی ہی اٹھ گیا ہے کم بخت کا! اب تو شادی پر ہی آئے گی۔مٹھائی اور جوڑا بٹورنے! اور دوسرا کل کے بعد تو نہ آئی اتنی جلدی ۔۔۔۔۔بس بھاگ لی سمجھو!

اب اور کس پر رعب جماؤں میں۔ ویسے بھی کون پڑھ کر پڑھ کرے خانہ داری! اری مجھ سا طالب علم تو دوسروں کی نقل مارنے سے پہلے، اپنا سبق بھی بھول جائے۔

برسات کے دن بھی کیا دن تھے۔۔۔۔۔۔کم بخت گزرنے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ آئے دن کی تیز بارشوں نے تو گھر میں ہی سیلاب بنا رکھا تھا۔ بچے کاغذ کی کشتیاں چلا چلا کر خوش ہو رہے ہیں، تو بڑے قینچیوں کی طرح زبانیں۔۔۔۔۔۔ہونہہ!

ہفتے میں ایک دو بار کیا حرج ہے مگر یہ روز روز کی بارش اور پکوڑوں کی فرمائش!

ہائے اللہ مارے۔۔۔۔۔۔آسمان سے کیوں نہیں برستے یہ پکوڑے۔۔۔۔۔۔نگوڑے!!!

☆☆☆

آج تو مقدر ہی پلٹا ہوا ہے۔ مانا کہ کل منگنی کی رسم کا بکھیڑا کم ہی رہا کہ ساس، سسر روایتی اسلامی طور طریقوں کے قائل نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ورنہ تو۔۔۔۔۔انہیں بھی پتہ لگ جاتا ہماری منگنی کی رسموں کا۔۔۔۔۔پھر بھی تھکاوٹ تو تھکاوٹ ہی ہے ناں! قسم سے کمر کا تختہ ہی الٹ گیا ہے۔ جم کر بیٹھے رہنے سے۔ مگر یہاں چلانے سے فائدہ۔۔۔ کسی کو احساس تھوڑا ہی ہوگا۔ بے حسی کی تو انتہا ہے اس گھر میں۔۔۔

اب انہی بہنوں کے کہے میں آ کر اماں ابا نے برسات کے لت پت دنوں میں منگنی نمٹالی کہ بچوں کی سکول کی چھٹیاں تھیں۔ مگر کاموں کی باری آئی تو وہی آئیں بائیں اور شائیں۔۔۔۔۔۔تینوں کی۔

آج تو یہ کام کوئی بھی کر سکتا تھا مگر اماں بی ہی بول اٹھیں۔ "اری منی، گھر آئی بہنوں کے لیے اتنا بھی نہیں ہوتا تجھ سے۔۔۔۔۔۔!"

جی میں آتا ہے کہ کہہ ڈالوں کہ ہاں اماں نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔جایئے اپنے گھر۔۔۔۔۔۔ہونہہ۔۔۔۔۔۔مگر پھر ابا میاں پر ترس آ جاتا ہے۔ جو بے چارے ہر لمحے سب کو راضی رکھنے کی کوشش میں تھالی کے بینگن کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکتے پھرتے ہیں۔ اگر مجلی تو آ جائیں گے سمجھانے کو۔

"اری منی بٹیا رانی۔۔۔۔۔۔تمہارے ہاتھوں سے تلے پکوڑوں کا تو مزہ ہی الگ ہے اور پھر وہ چٹنی جو تم پیستی ہو۔ بھئی واہ سونے پہ سہاگہ ہے بٹیا!"

کیا پکوڑے اور کیسی چٹنی! ابا میاں کل تو دماغ رہا ہے میرا اور پیس تو دانت رہی ہوں آج! مگر

انہیں کیا خبر ہوگی؟ وہ یہ روایتی خوش دلی دکھانے کو کان کے قریب آ کر پھونک دیں گے۔

"اری تیری بہنیں تو نگوڑیاں باورچی خانے میں گھسے بغیر ہی سسرال جا پہنچی ہیں۔۔۔۔۔۔ پھر اب تو، تُو بھی دِنوں کی مہمان ہے بیٹی۔ بعد میں کون تلے گا پکوڑے اس گھر میں۔ بازار ہی سے لانے ہوں گے۔

ابا میاں کو بھی چسکا ہی تھا پکوڑوں کا۔ مجھے یاد ہے کبھی کبھی بچپن میں، کبھی کبھی بچپن میں پاس کے بازار سے پکوڑے لینے جاتی جہاں ایک بڑھیا نے گھر کی کھڑکی کھول کر پکوڑوں کا تھال جما رکھا تھا۔ کبھی کبھی بچے اس کا دھیان نہ پا کر ایک آدھ پکوڑا اچک لے جاتے اور وہ پنجابی زبان میں موٹی موٹی گالیاں نکال کر دل ہلکا کر لیا کرتی تھی۔

آئے ہائے کہیں گھر والوں نے مجھے بھی پکوڑوں والی بڑھیا ہی تو نہیں سمجھ لیا۔

پھر ابا میاں کو تھوڑا ہی ٹال سکتی ہوں میں۔ ایک بے چارے ابا میاں ہی تو ہیں جو میٹھے ہیں اس گھر میں۔۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔

ارے بینگن تو ملا نہیں سو میں نے مرچیں ہی کترنا شروع کر دیں۔ ہری مرچ نہ ہوئی تو کوئی پکوڑا منہ میں نہیں رکھے گا۔

پتہ نہیں کیوں مرچیں کترتے ہی خالدہ آپی کا سراپا خیال میں جھول گیا۔ جنہیں ہر وقت کے بڑکپن نے مرچ ہی تو بنا رکھا تھا۔ ذرا چکھو اور سوں سوں کرتی زبان بولنے کے قابل ہی نہ رہے۔ یوں تو برس ہوئے اماں کو یہ مرچوں کا پودا اکھاڑ کر، دوسروں کے گھر لگائے مگر مجوست ایسی کے گھر سے جاتی نہیں! قدم رکھا نہیں اور جھگڑا شروع۔ اس نے یہ کیوں کہا۔ اس نے یہ کیوں کیا! مگر مجال ہے اماں، ابا ان کے آگے زبان کھولیں۔ یہی حال ان کے شوہر نامدار کا ہے۔ صدیاں بیت گئیں مگر ان کی چچکی نہ ٹوٹی۔ کوئی اولاد نہیں مگر نہ شکوہ نہ شکایت۔ بس شوفر کی طرح افسر بیوی کو دفتر اور دفتر سے گھر لانا اور بات بے بات خوشامد کرنا۔ اللہ پناہ! قسم سے کوئی کتا بھی ہوتا تو دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ تبھی تو ہے یہ غرور، یہ تکبر، جیسے ان کے علاوہ تو کوئی دوسرا موجود ہی نہیں۔ ویسے بھی اتنی چُنی آنکھوں سے دیکھے بھی تو کیا۔۔۔۔۔۔ بس اپنا چہرہ!۔۔۔۔۔۔ "آخر لوگ ہمارا چہرہ ہی تو دیکھتے ہیں۔" تبھی تو اس عمر میں بھی گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی لیپا پوتی میں مصروف رہتی ہیں کہ چہرہ چھپائیں بھی تو کہاں۔ ایک آئینہ ہی تو ہے جو برداشت کر لیتا اور کچھ بولتا بھی نہیں

۔۔۔۔۔۔۔ویسے تو آئینے سے بھی جھگڑتی رہتی ہیں۔"بول آئینے۔۔۔۔۔۔بول"۔لگتا ہے بلوا کے چھوڑیں گی،ایک روز! ہونہہ انسان غلط فہمی پالے،مگر خوش فہمی نہ پالے۔

تھو۔۔۔۔۔۔تھو۔۔۔۔۔۔اُخ۔۔۔۔۔۔ارے ارے بے خیالی میں چمچہ بھر نمک کیا الٹ دیا۔سارا آمیزہ ہی زیر ہو گیا۔کس کا نام لے لیا تھا میں نے۔

اور یہی نہیں۔۔۔کچھ اور بیسن ملانے کے چکر میں بیسن کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ۔۔۔آواز پڑ گئی۔

"اری منی! کہاں رہ گئی ہے تو!" اماں بی نے اپنے جسم سے بھی بھاری آواز کا ایسا دھکا دیا کہ ڈبہ،بیسن سمیت ہی پیالے میں الٹ گیا اور پیالہ۔۔۔۔۔۔اوندھے منہ زمین پر کود گیا۔

دھماکے کی آواز سن کر اماں چپل گھسیٹتی آ پہنچیں۔"اری ہوش میں تو ہے تو بخت۔۔۔۔۔۔یا منگنی کا بھوت سوار ہو گیا ہے،تجھ پر،ناچ رہی ہے کیا باورچی خانے میں۔۔۔۔۔۔! چل جلدی کر سمیٹ لے سب۔۔۔۔۔۔خالدہ نے دیکھ لیا تو۔۔۔۔۔۔میں تب تک ذرا نماز پڑھ لوں۔

اور اماں بی گیند کی طرح باہر لڑھک گئیں۔میں نے چڑ کر سب کچھ صاف کر ڈالا۔برا بھلا سہارنے کا کوئی موڈ نہ تھا میرا۔۔۔

☆☆☆

لفافے سے نکال کر،نیا بیسن گھول کر،میں مصالحے ملانے لگی۔ٹوکری کے نیچے چھپا ایک آلو بھی برآمد ہو گیا۔اچانک باورچی خانے کی کھڑکی میں اماں کی لاڈلی منجھلی آپی کا آلو نما کا چہرہ طلوع ہو گیا۔جیسے ٹی وی کی سکرین میں تھوڑی دیر کے لئے کسی اسلامی پروگرام میں ایک حجاب پوش خاتون ہلکے پھلکے میک اپ میں جلوہ افروز ہوئی ہو۔اعتماد اور لاتعلقی میں ایسی لگ رہی تھی جیسے ٹی وی میں سے ہی جھانک رہی ہوں۔پھر تسبیح لئے دو ہاتھ ابھرے اور حجاب پوش خاتون نے کچھ تسبیح پر اور کچھ ناظرین یعنی میری جانب پھونکا اور آگے بڑھ گئیں۔

یہ منجھلی آپی تھیں،عابدہ۔۔اُنہیں تسلی ہو گئی تھی کہ کام ہو رہا ہے۔اللہ اللہ خیر صلا۔۔

یہ تو عمر نکلی جا رہی تھی سو جہاں اللہ نے چاہا بیاہی گئی تھیں ورنہ گھر میں تھیں تو کون سا فرق پڑ رہا تھا مجھے۔ہر کام کے لئے آواز مجھے ہی دیا کرتی تھیں۔

اری مُنی،میری بہن! ذرا تسلے میں آٹا تو چھان دیجو،میں آ کر گوندھ لوں گی۔

"ذرا بھوانے سے دال نکال کر فریج میں رکھ دیجو،کہیں خراب نہ ہو جائے۔"

"اری دیکھیو! کہیں بلی منہ نہ مار جائے دودھ کے ڈول میں۔۔۔۔۔!"

اپنی دفعہ کہیں لاڈ سے پیسے مانگ لو تو پرس جھاڑ کر دکھا دیں گی۔ مُنی! قسم سے ایک دھیلہ بھی نہیں ہے۔ کنجوس، مکھی چوس۔۔۔۔ویسے جب دیکھو راجہ بازار کے چکر پہ چکر لگا رہی ہیں، جیسے کمیٹی ڈال رکھی ہو اور وہاں سے واپسی پر یہاں براجمان ہونا جیسے فرض ہو ان پر، کاموں سے جان چھڑانے کو اور خواہ مخواہ کا عبادت رعب بھی! وقت بے وقت نماز، نفل، دعائیں، وظیفے اور "وہم" وہیں کا وہیں۔ ہائے بلی رو رہی ہے کچھ ہونے والا ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ ڈر ور تو بس میکے میں نخرے دکھانے کو تھا۔ سسرال میں تو عبادت گزاری کی ایسی پناہ لے رکھی تھی کہ ہر کوئی عزت کرنے پر مجبور دکھائی دیتا تھا۔ ایک تو کرارا لہجہ۔۔۔۔۔ اوپر سے الحمدللہ، ماشاءاللہ، انشاءاللہ کا بھگار!

پتا ہی تو لیتی تھیں۔ پھر کوئی راز اگل دے تو جھٹ اپنے پلو میں گرہ باندھ لی اور دوسرے کے گلے میں تعویذ کا پھندا ڈال دیا اور بس ہو گیا "وش" میں۔۔۔۔۔ اناللہ!

میں جانوں۔۔۔۔۔ یہ مٹھاس۔۔۔۔۔ یہ خلوص تو سب اوپر اوپر کی ملائی تھی۔ نیچے سب "پھوک"۔۔۔۔۔ اندر ہی اندر میٹھی چھری سمجھ لو۔۔۔۔۔ اور یہی نہیں۔۔۔۔۔ ایک چھری بغل میں بھی رہتی تھی۔۔۔۔۔ میں جانوں، اُوپر کا رام رام جپنا حب دکھاوا تھا۔ یہ رام رام جپ کر یہ پرایا مال اپنانے کا گر بھی جانتی تھی۔ سبھی گن ہیں اِن میں۔۔۔ ڈرامہ کہیں کی۔۔۔!! تحفے لینے کا شوق الگ اور نہ ملے تو مالِ غنیمت سمجھ کر ہی سمیٹ لیا۔ یہ جو پیٹ باہر نکل رہا ہے۔ لکڑ پتھر ہضم کا نتیجہ ہی تو ہے۔ ایک ہاتھ سے مرغن غذائیں اڑائیں اور دوسرے ہاتھ سے بلڈ پریشر کی گولیاں گلے میں جھونک دیں۔ پھر مجال ہے کہ کوئی الزام بھی آ جائے سادگی کی اوڑھنی اور مگر مچھ کے آنسو۔۔۔۔۔! سبھی گن تھے اُن میں۔۔۔۔۔

اور تو اور اپنی بیٹیوں کو بھی اپنے جیسا ہی بنا ڈالا تھا انہوں نے۔ مجال ہے ذرا خالہ کا ہاتھ ہی بٹا دیں۔ بس ٹی وی میں ڈیلے دیئے پڑی ہیں۔ منحوس کہیں کی۔

ہائے اللہ!۔۔۔۔۔ میں نے پالک کے پتے، ڈنڈیوں سے الگ کیے ہی تھے کہ انگوٹھے پر چھری پھر گئی۔ میں نے جھٹ انگوٹھا منہ میں ڈال لیا۔ آنسوؤں کا سیلاب، آنکھوں میں امڈ آیا۔ میرا بس چلتا تو آنسوؤں ہی میں بیسن گھول ڈالتی۔ مگر میں چپکی ہو رہی اور پالک چھوڑ کر پیاز کاٹنے

لگی کہ اگر چھوٹی آپی شاہدہ کی نظر بھی پڑ گئی تو کھل گیا دفتر تفتیش کا! کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا۔ کب ہوا۔۔۔۔۔۔کس نے کیا۔۔۔۔۔۔ کیسے کیا۔۔۔۔۔۔آ ئے ہائے ان کو تو حکومت کی انتظامیہ ہی میں کوئی عہدہ مل جاتا۔ سب کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

خدا لگتی کہوں تو فاطمہ بی کا۔ بچا کھچا دماغ بھی انہی نے کھالیا تھا۔ ضد تھی یا شرط کہ بس ایسا رشتہ لائے کہ جہاں سرے سے ساس سسر کا چکر ہی نہ ہو۔ اب قسمت دیکھو کہ نند بھی نہیں ہے۔ مزے میں ہیں جب دل کیا آ گھستی ہیں میکے میں اور پھر خبر ملی نہیں کہ عابدہ آپی میکے آئی ہیں۔ بس پہنچ لیں اپنے بیٹے کو گھسیٹتے ہوئے۔ پکوڑے کھانے کا چسکا انہیں سب سے زیادہ ہے۔ مگر اصل چٹورپن ہے میری باتوں کا! رپورٹ جو چاہیے وہ بھی مصالحے دار، میں آنسوؤں ہی میں مسکرادی۔ کھڑکی کا چینل بدلا اور شاہدہ آپی کا بدتمیز لڑکا، میرا منہ چڑا کر دفعہ ہوگیا" پکوڑے کب بنیں گے۔۔۔ "موسی!" خالہ کہتے ہوئے موے کی زبان جلتی ہے۔ Cable کا بچہ! میں مسکرادی۔ ابا مجھے یوں آپ ہی آپ مسکراتے دیکھتے تو ضرور کہتے۔

"ارے بھئی، اپنی ضیا تو بس بھولی بھالی گڑیا ہے ابھی تک۔"

☆☆☆

میں۔۔۔۔۔۔مائدہ۔۔۔۔۔۔عرف منی۔۔۔۔۔۔ایسی بھی چُغد نہ تھی۔ بس ذرا تعلیم کی کمی رہ گئی تھی ورنہ۔۔۔۔۔۔بس، کسی نے پڑھنے ہی نہیں دیا ورنہ صحافت، سیاست اور ۔۔۔۔۔۔فلسفہ کیا برا تھا۔ میں تو پڑھے بنا ہی اتنی سمجھدار ہوں۔ اگر پڑھ لکھ جاتی صحافی ہی بن جاتی۔ خبریں بنانا کون سا مشکل ہے۔ ادھر ادھر کی خبریں۔ فلاں گھر میں بھوت ہیں۔ گائیں نے دو سروں والا بچہ دیا۔ بلی کی بددعا۔۔۔۔۔۔ارے چھوڑو۔ کسی سیاست دان کا بیان ہو یا فلسفہ دان کی تک بندیاں سب جھوٹ، سچ کا آمیزہ ہی تو ہے۔ ان بھلے پکوڑوں جیسا۔۔۔۔۔۔اب پکوڑوں کی بھی کوئی خاص ترکیب تھوڑا ہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔تھوڑا یہ ڈالا۔۔۔۔۔۔تھوڑا وہ ڈالا۔۔۔۔۔۔اور اوپر سے چمچہ بھر مصالحوں کا۔۔۔۔۔۔اور آ گیا بیسن کے ذائقے میں نکھار۔۔۔۔۔۔! یہ بات۔۔۔۔۔۔! میں نے خوش ہو کر تالی بجائی۔۔۔۔۔۔!

اچانک چھوٹی بھابی کی رونی شکل دکھائی دی۔ جو تالی کی آواز سن کر شاید بیرے کی طرح آ پہنچی تھیں۔ "ہاتھ بتادوں! منی!"۔۔۔۔۔۔

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔میں نے صاف انکار کر دیا۔ بھابی کے ہاتھ لگوا کر اماں کی صلواتیں کون سنے۔'' وہ چپکی ہو کر باورچی خانے سے نکل گئیں۔۔۔۔۔۔

ارے میں تو بھول گئی۔ بھابھیوں کو۔۔۔۔۔۔اتنا ہاٹ ٹاپک! تیل کی چھینٹ کڑھائی سے نکل کر سیدھی میری ناک پر پڑی۔ ہائے! میرے منہ سے نکلا۔۔۔۔۔۔

خیر سے تین تین بھابھیاں ہیں گھر میں۔ تین بھائیوں کی۔۔۔۔۔۔جو نہ تین میں ہیں نہ تیرہ میں۔ میرا مطلب ہے۔ جب چاہا اِن اور جب چاہا 'آؤٹ'۔۔۔۔۔۔اور شاہدہ آپی کے بعد میں ہی تو ہوں دوطرفہ رابطوں کا ذریعہ! کیوں کہ میں سمجھ دار ہی نہیں سب سے زیادہ تمیز دار بھی ہوں۔ اماں کی پالیسیوں کو محتاط انداز میں عملی جامہ پہناتا کہ کسی کا بھید نہ کھلے اور اندر کی بات اور باہر کی بات کا تضاد پکڑا نہ جاسکے۔۔۔۔۔۔یہی تو کمال تھا میرا۔ ورنہ اماں کہاں سنبھال پاتیں۔ یہ کاروبار!

ویسے تو ہندوؤں کی طرح جب لڑکی پیدا ہوتی، اماں ابا منہ بسور لیتے مگر عابد، ماجد اور حامد بھیا بڑے ہو گئے تو اماں نے لڑکیوں کو سر چڑھا لیا بلکہ لڑکوں پر سوار ہی تو کر دیا تا کہ گھر کا اندرونی کنٹرول متاثر نہ ہونے پائے۔ تبھی تو جتنے چاؤ اور رسم و رواج کے ساتھ لڑکیوں کی شادیاں کی، اتنی ہی بے چارگی سے تینوں بھائی، بھابھیاں بیاہ کر لے آئے اور ان کے ناموں سے مجھے کیا لینا دینا! ہونہہ۔۔

ویسے اماں نے فاطمہ بی بی کی ماہرانہ مشوروں میں چن چن کر ایسی بہوئیں ڈھونڈ نکالیں جو ان کے آگے سر نہ اٹھا سکیں اور نہ ہی سر جوڑ سکیں۔۔۔۔۔۔آپس میں۔۔۔۔۔۔

اماں بی جنہیں سکول کی شکل دیکھنے سے پہلے ہی سسرال سدھار دیا گیا تھا، ماں تو جیسی بنیں، سو بنیں۔۔۔۔۔۔''ساس'' ضرور نکل آئی تھیں جیسے کیڑوں کو برسات کا موسم راس آ جاتا ہے بس اپنی ساس کے نقش قدم پر رواں دواں تھیں۔ کہنے کو کسی کے اچھے برے میں نہ تھیں مگر اپنا، اچھا برا، نمٹانا انہیں خوب آتا تھا۔ ڈھیلے پیچوں اور کھلے جبڑوں کو کسنا۔ کوئی ان سے سیکھتا! کوئی اکڑتا تو سپاری کی طرح کتر ہی تو ڈالتیں۔ مگر پھر انہیں اپنی لڑکیوں پر بھروسہ کرنا پڑا۔ ہم زبانیں چلاتیں اور وہ سر دھنتا! کوئی سسرال میں کرے ہم تو میکے میں راج کرتی تھیں۔ اجی یوں کہیے ہم ہی وہ چار پہیے تھیں جن پر گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ ہم ہی تو ''چار ستیں'' تھیں جن کی ''اور'' دیکھے بغیر گھر کے فیصلے طے نہیں پاتے تھے۔ ہماری شان تو لاہور کی چوبرجی کے برجوں سے بھی بلند تھی۔ کاش چوبرجی پنڈی میں ہوتی!

میں نے گن کر چار پکوڑے، کڑھائی میں جھونک دیئے اور ان کے تلنے کا مزا لینے لگی۔

اماں نے نا جانے کیسے ہم چاروں میں ایک "ساس" بیدار کردی تھی۔ یا پھر یہ موئی Cable کا کمال تھا جہاں چوبیس گھنٹے ساس بہو کے ڈرامے لگے رہتے۔ اماں بی نے ہندوستان چھوڑ دیا مگر ان کا دل اب بھی ہندوستانی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ہر رشتہ طے کرتے وقت حلفیہ بیان دیتی اور لیتی تھیں۔ "ہم ہندوستانی ہیں"۔ "آپ ہندوستانی ہیں؟" کبھی کبھی میں سوچتی ہم آخر پاکستان میں کیا کررہے ہیں؟ پاکستان آ کر بھی ہم میں کیا تبدیلی آئی ہے۔ وہی دم درود، تعویذ گنڈے جادو ٹونے، دھاگے، منتیں، نیازیں۔۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیا کیا ٹوٹکے۔۔۔۔۔۔ اماں تو اماں پر میٹرک پاس ہوکر ابا میاں کیوں آخر ٹوٹ بٹوٹ بنے رہتے ہیں۔ نہ داڑھی نہ مونچھ اوپر سے کرتہ، پاجامہ، کبھی کبھی لگتا کہ نماز کی ٹوپی اتاریں گے تو "بودی" نکل آئی گی اور کوئی بھجن گانا شروع کردیں گے جن سے سارا دن ہمارا گھر بجتا رہتا ہے۔ لگتا ہے ابا کی ٹوپی، لوہے کی ہے جس نے کبھی ان کا دماغ بڑھنے ہی نہیں دیا۔ پہلے ہی وہ چھ سات بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ اوپر سے اماں پڑ گئیں پلے اور نیچے سے ہم چار نگوڑیاں! اور نگوڑے بھائی کہ کسی کام کے نہیں!

ان نگوڑدوں کو تو اماں نے جہیز اکٹھا کرنے کے لیے بڑا کیا ہے۔ ورنہ ابا میں تو سکت نہ تھی کہ اماں کی ٹوٹی چار پائی ہی بدل دیں جو کروٹ کروٹ افریقی موسیقی بجاتی رہتی ہے۔

اپنی نا اہلی کی وجہ سے ابا ہمیشہ ہی اماں کے آگے چپ سادھے رہتے چاہے انہیں اماں کی جہالت سے کتنی ہی ناگواری ہوتی۔ اماں بھابھیوں کو دبانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں اور اگر کوئی بھائی منہ کھولتا تو کہتیں "دیکھا موا، بیوی کے نیچے لگا ہوا ہے۔" بیٹی کہنا تو دور، اماں انہیں بہو تسلیم کرنے کو بھی تیار نہ تھیں۔ بات بیسن ہوتی اور اماں ملا جلا کر پکوڑا بنا ڈالتیں اور کم بخت آپیاں آ پہنچتیں پکوڑے نوش فرمانے۔ میرا کام تو بس چٹنی بنانا تھا۔

ہائے اللہ آخر ان سب کو "دان" کیوں نہیں کردیا اماں نے۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

یاد آیا۔۔۔۔۔۔ ارے ہاں، پکوڑے میں تو بھول ہی گئی۔۔۔۔۔۔ ابھی جل ہی تو جاتے۔۔۔۔۔۔ آخر میرا دھیان کدھر رہے۔

میں نے جلدی جلدی پکوڑوں کی اگلی کھیپ، کڑاہی کی نظر کی اور ماتھے پر سے پسینے کا ڈھیر پونچھ ڈالا۔ بیسن کا آمیزہ ماتھے پر جا چکا۔ میں نے کھڑکی میں ٹنگے پرانے ڈیزائن کے ٹوٹے ہوئے

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ جو ابا صبح صبح شیو بنانے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔۔۔

بالوں اور چہرے پر گئی شام کی افشاں کے آثار ابھی باقی ہے اور میرے چہرے پر منگنی کی تھکاوٹ کے۔۔۔۔۔۔ جنہوں نے سارے فیملی ٹریڈ مارکس اور بھی واضح کر دیے تھے۔ وہی چپٹی آنکھیں، پھیلا ہوا ناک اور موٹے موٹے ہونٹ۔ ٹوٹے ہوئے آئینے نے تو میری شکل اور بھی بگاڑ دی۔ پکوڑا الگ رہی تھی میں۔۔۔ میں نے جل کر آئینے سے نظر ہٹالی۔ کاش میں بڑی نہ ہوتی تو آج بارش میں، پاس کے کمیٹی باغ میں سہیلیوں کے سنگ جھولا جھول رہی ہوتی۔ ایسے میں ہم سب صوفی تبسم کی نظمیں گایا کرتی تھیں۔ منے کی ماں نے انڈا ابالا۔۔۔ رولے "منے" رولے اور میری شکل پھر سے رونی ہوگئی۔ آخر صوفی تبسم نے ساری نظمیں منے پر کیوں لکھیں، منی پر کیوں نہیں!

کہنے کو میری شکل وصورت ساری بہنوں سے بہتر تھی۔ مگر قد کچھ چھوٹا تھا، نہیں تو شاید میرے پیچھے بھی کوئی ہندوستانی گانا گاتے ہوئے پہنچ جاتا۔۔۔ قسم خدا کی کتنی منتیں مانگیں، وظیفے کرڈالے کہ خدارا! نوشین کی طرح میرے لیے بھی امریکہ سے رشتہ آجائے کہ وہاں تو ساس، بہو کا چکر نہیں ہوگا۔ یا پھر کوئی کرن کی طرح بیاہ کر سعودی عرب ہی لے جائے کہ وہاں کا اسلام ہمارے ملک جیسا نہیں۔ مگر میری قسمت اپنی سہیلیوں کی طرح کہاں تھی اور فاطمہ بی جو گھر آتے جاتے "شاہ کی ٹالیاں" کے قبرستان سے ہوکر گزرتی رہتی ہو یسے ہی آسیب زدہ تھی۔ پتہ نہیں کس بھوت سے میری شادی کروا رہی تھی۔

کم بخت فاطمہ بی۔ پتہ نہیں کہاں دفعہ ہوگئی تھی آج!

میں نے چولہے کی آگ دیمی کی ورنہ پکوڑے تو جلنے ہی والے تھے۔ میں نے پکوڑوں کی ایک اور نسل کو باہر نکالا اور اگلی کو کڑاہی کی نظر کر دیا۔

آئے ہائے! یہ دنیا تو مکافات عمل کی جگہ۔ پتہ نہیں اپنے اگلے گھر کیسے کیسے پکوڑے تلے جانے والے ہیں۔ بس یونہی کبھی کبھی Civilwars کے خیال سے ڈر لگنے لگتا۔

اچانک سے میرے کٹے ہوئے انگوٹھے اور جلی ہوئی ناک میں درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ جس طرح کل فاطمہ بی بی کی باتوں سے دل میں اٹھی تھیں۔ آخر ضرورت ہی کیا تھی اسے دوسروں کی باتیں سننے کی۔ کم بخت ماری، پھپھے کٹنی، میراثن، چغل خورن، ڈائن، اگر کان میں کچھ ایسا ویسا پڑ ہی گیا تھا تو مجھے بتانے کی ضرورت کیا تھی۔ بس پیٹ میں کچھ نکتا نہیں ناں! اگل دیا سب اگال دان سمجھ کر۔

ارے ستیاناس ہی تو کرڈالا ساری خوشی کا منحوس نے!

کل میری سہیلی نجمہ مجھے "تیار" کر رہی تھی۔ تیاری کا سامان تو بھیج دیا تھا مگر لڑکے والے ابھی نہیں آئے تھے۔ صبح سے کام میں جتی بھاوجوں کو دودھ کی مکھیوں کی طرح نکال باہر کرنے کے بعد باقی کا سب ضروری کام آپیوں نے آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ بس پتہ نہیں کب سروتا چلاتی اماں اور ٹی وی دیکھتے ابا کی نظریں بچا کر تینوں بھابھیاں چھت پر پہنچ گئیں۔ بھائی پتہ نہیں کہاں معروف تھے ورنہ ضرور ٹوک دیتے۔ وہ اماں کی پالیسی سمجھتے تھے۔ اب قسمت خراب کہ فاطمہ بی کسی کام سے اوپر جا پہنچیں۔ ابھی اپنا ہندوستانی سٹائل کا چوڑی دار پاجامہ، زینے سے برآمد ہوا ہی تھا کہ بڑی بھابی نے فاطمہ بی کو اپنی طرف دھکیل لیا۔

"ارے آیئے آیئے فاطمہ خالہ! کہیے تو اکٹھی ہو گئیں۔ سب کی سب چڑیلیں۔"

"کون سی چڑیلیں، بیٹا!" فاطمہ بی گڑبڑا گئیں۔ سپاری کی پوٹلی ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ چڑیلیں نہیں ڈائنیں۔ منجھلی بھابی نے منہ کھولا! نہیں بھابی ڈائنیں بھی تو۔ سات گھر چھوڑ دیا کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔ چھوٹی بولی۔

تو پھر جادوگرنیاں۔ وہ نہیں ہوتی بچوں کی فلم میں چار ستوں کی Wicked Witches ۔۔۔۔۔۔ وہ سب میں زیادہ پڑھی لکھی تھیں۔"

ہم کو انگریزی نہیں آتی بٹیا۔ فاطمہ بی بڑبڑائیں۔

اچھا چھوڑو ہم تو یونہی مذاق کر رہے تھے۔ لگتا ہے آج پکوڑے نہیں بنیں گے۔ کیونکہ "چٹنی" تیار نہیں ہوئی ابھی۔"

پتہ نہیں اس کے پلے کچھ پڑا یا نہیں مگر سب اُگل کر ہی دم لیا۔ اماں تو کہہ رہی تھیں، بہوؤں کی زبان پر سروتا۔۔۔ کسی نے میرے سسرال میں منہ کھولا تو۔۔۔۔

☆☆☆

میں نے پکوڑے تھال میں پھیلا دیئے اور خاموشی سے منتظرین کے آگے رکھ دیئے۔ میں باقی کا کام نمٹانے کے بہانے کھسک رہی تھی کہ جھٹ شاہدہ آپی کی آواز نے آگ لگا دی "اری منی کیا ہوا۔ یہ پکوڑے جلے جلے کیوں ہیں؟"

"اور چٹنی بھی نہیں بنائی کیا؟" ابا بھی ہوا دینے لگے۔

بی ہائنڈ دی سین

سینما ہال کھچا کھچ بھرا ہی تھا۔ تماش بینوں کی منتظر نگاہیں، ایک ٹک، وزنی مخملی پردے پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے اسے چھید رہی ہوں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہی دیر میں پردہ سکرین کو چھپانے والا وہ بے قصور مجرم، نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے تار تار ہو کر زمین پر گر جانے والا ہے۔

اخباری رپورٹروں کے یک بصری کیمرے نہایت یکسوئی سے، لوگوں کا اشتیاق نظر بند کرنے میں معروف تھے۔

بات کوئی ایسی خاص تو نہ تھی۔ بس ایک نئی فلم ہی تو ریلیز ہونے جا رہی تھی۔ ایک ایسی فلم جس کی مشہوری تقریباً پچھلے ایک سال سے جاری تھی۔ ایڈورٹائزنگ کی خاطر، فلم کے بارے میں تصویری فیچرز اور انٹرویوز شائع بھی ہوتے رہے اور نشر بھی Behind the Scene میں شوٹنگ کے مراحل بھی، قبل از وقت ہی اتنے مقبول ہو گئے تھے جتنا کے گانے اور یوں کہانی کے واضح ہونے سے پہلے ہی گانوں کے بول، پرستاروں کے لبوں پر "چڑھ" گئے تھے اور ریڈیو پر Live فرمائشیں ہونے لگیں تھیں۔ سینما ہالوں میں دکھائی جانیوالی تمام ہی فلموں کے آغاز سے پہلے، اس فلم کا تعارف کروانا کچھ "لازمی" سا ہو گیا تھا۔

ویسے تو اس فلم کو پبلسٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کی وجہ فلم کی کہانی تھی نہ گانے۔ وہ وجہ تھی۔ اداکارہ سویرا۔ جو بڑی سکرین کے اندھیر نگر میں اجالا بن کر چھا گئی تھی اور اس "چھائے" جانے کی وجہ تھی سویرا کی پرکشش شخصیت پر آویزاں دو آنکھیں!

آنکھیں جو اتنی حسین تھیں کہ کوئی روایتی مثال ان کے معیار پر پورا اترنے سے شرماتی تھی۔ تو بس اتنا ہی کہ جو ان آنکھوں کو ایک بار دیکھ لیتا، دیکھتا ہی رہ جاتا اور اپنی پلکیں جھپکانا بھول جاتا۔

اپنی ان آنکھوں کی بدولت، سویرا بہت جلد شہرت کی بلندی کے اس مقام پر جا پہنچی تھی جہاں

کا قدم قدم سیڑھیاں چڑھنے والے، صرف تصور ہی کر سکتے ہیں۔ اسی لیے تو بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھی وہ۔

سویرا کی بدولت "پبلک" چھوٹی سکرینیں، گھروں میں چھوڑ کر بڑی سکرین دیکھنے نکل آئی تھی اور یہ پہلا موقع ہی تو تھا کہ غیر ممالک میں بھی اس فلم کی بدولت، ملک کی پہچان ہونے جا رہی تھی۔

☆☆☆

سکول کے چھوٹے سے سٹیج پر کبھی پری تو کبھی شہزادی کے روپ میں جلوہ افروز ہونیوالی ننھی سی سمیرا، جب کالج میں پہنچی تو پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ وہ تو سچ مچ کی ہی پری یا شہزادی ہے۔

سمیرا کا نام، جلد ہی، تمام ہی ڈیپارٹمنٹس کی تمام ہی لڑکیوں اور لیکچراروں کے منہ پر "چڑھ" گیا۔ جلد ہی کینٹین والے "انکل" اور لائبریرین "آپا" سے لے کر کالج کا چوکیدار "بابا" اور گرلز ہاسٹل کی وارڈن "ٹن، ٹن" بھی سمیرا کو پہچاننے لگیں۔

وہ "آنکھوں والی" کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ مگر "بالوں والی" سے زیادہ مشہور!

وہ جہاں سے گزرتی لوگ اسے دیکھتے ہی رہ جاتے اور اپنی پلکیں جھپکانا بھول جاتے۔

یہ احساس پتہ نہیں لوگوں کے دیکھنے سے بیدار ہوا تھا یا اپنے دکھائی دینے سے کہ سمیرا کی آنکھوں میں سپنے ہی سپنے بھرنے لگے۔

دیکھے جانے کے سپنے!۔۔۔ یا پھر اپنی نابینا ماں کا سہارا بننے کے عزم نے سر اٹھا لیا تھا، جس کی اپنی آنکھیں، پانچ بے سہارا بچیوں کے مستقبل کے فکر میں سلائی کڑھائی کے دوران آنسو بہا بہا کر بے روشن ہو چکی تھیں۔

یا پھر دو بڑی بہنوں کو کم تعلیم کے بعد ملازمتوں کے لیے خوار ہوتے دیکھ کر۔ دو چھوٹی بہنوں کو "تحفظ" دینے کی خواہش نے جاگنا شروع کر دیا تھا۔

پھر جلد ہی اس پر خوش قسمتی کا دروازہ خود بخود ہی کھل گیا۔ جب سیکنڈ ایئر میں کسی دوسرے شہر سے "ہجرت" کر کے آنے والے ایک سرکاری افسر کی بیٹی تناشا، اس کی کلاس میں آئی۔

تناشا نے اپنی "لاکھوں میں ایک" سہیلی کو جلد ہی اپنے پورے خاندان سے متعارف کروا دیا جس میں ایک فلموں کے ڈائریکٹر بھی شامل تھے اور پھر ان کی آفر پر سمیرا Audition کے بغیر ہی منتخب ہو گئی۔

☆☆☆

پھر کیا ہوا! گلی گلی کی دیوار پر لگے اشتہارات، ہمیرا کو اس کی پہلی فلم میں ''سویرا'' کے نام سے متعارف کروایا گیا اور اس کے بعد۔۔۔۔فلمیں اس کے نام سے خود کو متعارف کروانے لگیں۔

وہ فلموں کے امتحانوں میں نا صرف پاس ہوئی بلکہ جلد ہی ''ایوارڈ یافتہ'' بھی!

شاید اسے دیکھنے والی آنکھوں نے اُسے ایسا Trained کر دیا تھا کہ سب کچھ سیکھے بغیر ہی آتا گیا۔ وہ ہر نیا چیلنج قبول کر لیتی۔ اسی لیے ہر نئے پرانے اداکار کی خواہش تھی کہ اسے کم از کم ایک بار ''سویرا'' کے ساتھ کاسٹ کیا جائے۔ ہر کہانی نویس کی تمنا تھی کہ اس کی کہانی ''سویرا'' کو پسند آ جائے۔ ہر شاعر ''سویرا'' کو ذہن میں رکھ کر گانے لکھ رہا تھا۔ ہر ہدایت کار ''سویرا'' کو ''ڈائریکٹ'' کرنے کا متمنی تھا۔ ہر پروڈیوسر کی کوشش تھی کہ وہ ''سویرا'' کی سرپرستی کرے اور ہر ڈسٹری بیوٹر چاہتا تھا کہ ''سویرا'' کی فلموں کو دنیا بھر میں پھیلا دے۔

''سویرا'' کو طلوع ہونے کے بعد اور کیا چاہیے تھا؟ ایک روشن دن جیسا مستقبل!

بس پھر کیا تھا آنے والے دنوں میں سویرا، معروف ہی معروف ہوتی گئی اور اس کی آنکھیں مشہور ہی مشہور!

اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس کس کا ''شکر'' ادا کرے۔ سب ہی اسے ''بنانے'' والے ہی تو تھے، ''بگاڑنے'' والوں میں جرأت کہاں تھی اس کے کردار کی مضبوطی سے ٹکرانے کی۔ اکثر ''نظر لگانے'' والی آنکھیں بھی، خود ہی جھک جایا کرتیں۔

گلی گلی کی دیوار دیوار پر لگے اشتہارات پر سویرا کی آنکھیں ''چپک'' گئیں۔

ذہن، ذہن، زبان، زبان پر ان آنکھوں کا عکس ''چھپ'' گیا۔

شاید آنکھوں کو خود بھی احساس تھا کہ وہ کتنی حسین ہیں۔

میک اپ کے غیر ملکی اشتہاروں میں سج کر وہ آنکھیں اور بھی چمک اٹھی تھیں۔ حالانکہ ان آنکھوں کو میک اپ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان آنکھوں کے اپنے رنگ کیا کم تھے؟

نیند سے بوجھل آنکھوں کے رنگ، خوابوں سے جاگی آنکھوں کے رنگ، دھوپ اور چھاؤں کے رنگ، ہر موڑ ہر موسم کے رنگ!

مگر اس کی آنکھوں کے تمام ''پروفیشنل'' رنگوں میں، ایک رنگ ایسا بھی تھا جو شاید کسی کو دکھائی نہ دیا تھا۔ اور وہ تھا، اس کے ''دل کا رنگ!''

☆☆☆

سویرا، شاید، ملک کی پہلی اداکارہ تھی جس نے عروج کی حد پر پہنچ کر ایسا فیصلہ کیا تھا۔
پہلے اس نے نابینا خواتین کی فلاح و بہبود و علاج معالجے کے لیے ایک سنٹر کھولا اور پھر اپنی موت کے بعد اپنی آنکھیں Donate کرنے کا اعلان کر کے، اس اقدام پر "خلوص کی مہر" ثبت کر ڈالی۔
"آپ نے ایسا کیوں کیا؟" کسی نے انٹرویو کے دوران سوال کیا۔ تو وہ بولی:
"بے سہارا عورتیں تو ویسے بھی اندھی ہو جاتی ہیں، جب انہیں اپنی بربادی کے علاوہ کوئی اور راستہ دکھائی نہیں دیتا تو اندھی عورت کہاں جائے؟
"اور وہ Donation؟" انٹرویوز کی 'فکرمندی' بھانپنے پر وہ بولی۔
"ارے بھئی میں زندگی میں تو آنکھیں نکال کر پلیٹ میں نہیں رکھنے والی"
وہ مسکرائی۔ مگر دل ہی دل میں رو دی۔ "کاش ایسا کر سکتی!" اس نے سوچا۔
سویرا کے عجیب فیصلے پر رشتہ دار اور پرستار کچھ پریشان ضرور ہوئے تھے۔ مگر دل ہی دل میں وہ سویرا کے قدردان ہو گئے تھے۔
سویرا فیصلوں کے لیے کسی Second Opinion کی محتاج نہ تھی اور اُس کی First Opinion تھی۔ دل کی تسلی!
سویرا کی ماں کے پاس اسے دینے کے لیے دعاؤں کے سوا تھا ہی کیا، وہ اندر ہی اندر کچھ مطمئن ہو گئی کہ اس کی بیٹی، "نظرِ بد" سے بچ گئی۔
مگر شاید ماں کی یہ تسلی جھوٹی تھی۔
پوری دنیا میں سر چڑھ کر بولنے والا جادو، جس کا توڑ کسی کے پاس نہ تھا، اسے اپنی ہی قسمت کی نظر لگ گئی۔ ایک روز اچانک ------

☆☆☆

Patriot Cancer Research Institute کی ڈاکٹر عظمیٰ خان کی پچھلی پانچ چھ سالہ محنت کا ثمر پکنے والا تھا۔ بچوں کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی Blindness کے پیچھے چھپی Behind the Scene جیسی، پراسرار Malignancy کے بارے میں ان کا اہم انکشاف اپنی حتمی نتائج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی ابتدائی تحقیق کے مراسلات اور

مقالات پہلے ہی ملکی اوغیر ملکی سطح پر زیر بحث آ چکے تھے۔ مگر ایک روز Lab میں ہونے والے ایک ناگہانی حادثے نے ان کی تمام تر توقعات ان سے چھین لیں اور جو آنکھیں، اس اہم تحقیق کا ناگزیر Tool تھیں، بجھ گئیں۔

ڈاکٹر عظمٰی خان کے منفرد زاویہ نظر اور تدارک کی کمی کے باعث تحقیقاتی مراحل میں خلا پیدا ہو گیا۔ پھر ایک روز اچانک۔۔۔۔۔۔

پھر ☆☆☆

تمام فلم بینوں کی آنکھیں، پردۂ سیمیں پر چپکی ہوئی تھیں۔ ایک نہیں تمام تر سینما گھر ہی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ حالانکہ فلم کی ایڈوانس بکنگ کے باعث بہت سے لوگ محروم رہ گئے تھے۔ ویسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایک نئی فلم ہی تو ریلیز ہوئی تھی آج۔ مگر یہ فلم اداکارہ سویرا کی آخری فلم تھی جس کا نام بدل کر "آنکھیں" رکھ دیا گیا تھا۔ فلم کے آخری مراحل کے دوران سویرا کی حادثاتی موت کے بعد فلم کو مختلف طور پر Windup کیا گیا تھا۔ جس کے باعث فلم کا سکرپٹ کچھ کمزور ضرور ہو گیا تھا۔ مگر فلم کی کہانی میں کسی کو دلچسپی کہاں تھی۔ سب کی آنکھیں صرف سویرا کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔

اگلے برس دنیا بھر کے وطن پرستوں کی آنکھیں ٹی وی سکرینوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر عظمٰی خان کو Nobel Prize دیا جا رہا تھا جو ملکی سطح پر یہ ایوارڈ حاصل کرنے والی پہلی خاتون تھیں۔ ڈاکٹر عظمٰی خان کچھ عرصہ قبل ہی اپنی ایک اہم ڈسکوری کے بارے میں اپنی تحقیق مکمل کر پائیں تھیں۔ مگر اسے تکمیل تک پہنچانے والا اہم ذریعہ، کسی کی آنکھوں کا تحفہ تھا۔ جو بہت سے لوگوں کے لیے Behind the Scene جیسا ایک راز تھا۔

ڈاکٹر عظمٰی خان کافی ضبط کے بعد بھی رو پڑیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بہت سے دیکھنے والوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

مگر آج ان آنکھوں کو اپنے اوپر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ صرف دکھائی دینے والی کوئی حسین شے نہیں تھیں۔ اب وہ دیکھ سکتی تھیں۔

ابراہیم

''اب۔۔۔۔۔۔را۔۔۔۔۔۔ہیم۔۔۔۔۔۔'' یہ کس زمانے کا نام ہے یار۔۔۔۔۔۔
کبھی کبھی میں سوچ سوچ میں اس تین ڈبوں والی ریل کو الگ الگ کر دیا کرتا۔

آج کل کے زمانے میں تو ایسے ناموں کا رواج باقی نہ رہا تھا۔ یا پھر کم از کم ہمارے ہاں یہ نام ''کامن'' نہیں تھا۔ اس لئے شاید پکارتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ کچھ دشواری، کچھ شرمندگی ۔۔۔۔۔۔نہیں نہیں ۔۔۔۔۔۔ کچھ شرم سی محسوس ہوتی ۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں ! ۔۔۔۔۔۔ حالانکہ کہنے کو تو ۔۔۔۔۔۔ ایم ، بیر ، ریس ، ہیٹ ۔۔۔۔۔۔ جیسے چار پانچ ، چھ ، سیلیبلو والے الفاظ بھی پورے کے پورے ایک ساتھ بولتے ہوئے ہماری زبانوں کی ریل کبھی پٹڑی سے نہ اترتی اور نہ ہی ہم سانی کی خاطر انہیں ''شارٹ'' کرنے کی کوشش ہی کیا کرتے ، مگر ۔۔۔۔۔۔ امریکہ میں رہتے رہتے ہمیں ، ناموں کے ساتھ ، بلا تکلف ، ایسی کانٹ چھانٹ والی بدسلوکی کرنے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی۔

ویسے آپس کی بات تو یہ ہے کہ ناموں کو چھوٹا کرنے میں کچھ شرارت تو تھی ہی ۔۔۔۔۔۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش بھی تھی کہ شاید ہم بھی امریکیوں کی طرح ، مخاطب کو ''غیر معمولی'' سے ''معمولی'' بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ Just Jokin!

مثلاً ، میں ، اُمین سے آمی بن کر آدھا آدھا محسوس کرنے لگتا ، مگر آہستہ آہستہ میں ، میں ہر کالے ، گورے اور پیلے رنگوں کے دوستوں کے اس انداز تخاطب کا ''عادی'' ہوتا جا رہا تھا۔

رامیش ، بیچارہ ، رام ، نہیں ''رامو'' کہلایا جاتا تو اسے یوں لگتا کسی نے 'پیغمبری' کا عہدہ چھین کر اسے گھر کا ملازم بنا ڈالا ہو۔ اسی طرح ہم نے ڈیوڈ کو ''ڈیو'' بنا ڈالا تو وہ کبھی تو خود کو دیوداس سمجھتا اور کبھی ''دیو'' سمجھ کر پریوں کی تلاش میں نکل پڑتا۔

ہم چارروم میٹس کی شراکت میں شریک لڑکوں میں تین پاکستانی اور ایک ہندوستانی تھا۔ تین پاکستانیوں میں دو مسلمان اور ایک عیسائی تھا۔ دو مسلمانوں میں ایک اکثریتی اور ایک قلیتی جماعت میں سے تھا۔ مگر ہم سب کی دوستی کچھ ایسی تھی، جیسے دنیا میں ایک ساتھ بسنے والے انسان۔۔۔۔ جن کو دنیا بنانے والے نے ہر گرم، سرد، حالات میں اکٹھا رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

ہماری بلڈنگ کا قد، خیر سے ستائیس منزل تھا۔ جسے قریب سے دیکھتے ہی ہماری گردنیں کندھوں کے دوسرے طرف، گرنے کی کوشش کرنے لگتیں۔ البتہ ہماری نظر اپنے اپارٹمنٹ جس کا نمبر 9 تھا کی بالکنی پر رک کر سکون کا سانس لیتے ہوئے، کچھ سدھر جاتی اور گردن بھی سیدھی ہو جاتی، بالکنی پر کچھ رنگ برنگے رومال، سگنل کی جھنڈیوں کی طرح لہراتے دکھائی دیتے جو ہم نے اپارٹمنٹ میں ایک دوسرے کی موجودگی کا پتہ دینے لیے، از راہ "Fun" لگا رکھے تھے۔ شاید ہم ابھی "بچے" تھے!۔۔۔۔۔۔ کچھ اور ناپختہ۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆

رومالوں کے رنگوں کے انتخاب میں ہماری اپنی اپنی مرضی کی جھلک تھی۔۔۔۔۔۔ اور مرضی میں ہماری شخصیات کی۔۔۔۔۔۔ شاید!

مثلاً رامیش، سرخ رنگ جیسا جوشیلا تھا جس کی طبیعت پر انڈین فلمی کلچر کی چھاپ نمایاں تھی، جس کے باعث وہ "رامو" بن کر گھر کا کام بھی کرتا اور اپنے ذہن کے الف لیلوی، طلسم کدہ میں کھویا بھی رہتا اور کبھی کبھی اس کی باتیں اور سرگرمیاں اس کے مذہبی عقیدے کی طرح، پریوں اور جنوں کی جادوئی کمالات جیسی کہانیاں لگنے لگتیں۔

ڈیوڈ کو نیلا رنگ پسند تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ علم و تحقیق کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا رہتا۔ پہلے پہل اس پر پاکستان کے عام عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والوں جیسا "مذہبی" رنگ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس رنگ میں امریکی ماحول کے شیڈز بھی ملتے جا رہے تھے۔

مجھے سبز رنگ ہمیشہ سے بھاتا تھا۔ جس سے آنکھوں کو ہی نہیں "من" کو بھی "شانتی" ملتی ہے۔ شاید اس لئے بچپن سے ہی میرے ہاتھوں میں "عالمی امن" کے لئے ایک سبز جھنڈا تھما ہوا تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ میرے اندر یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس دنیا کو ہر قسم کے رنگ و نسل، علاقائیت اور مذہبیت کے ابدی اختلافات کے باوجود بھی "امن" کی ضرورت ہے اس لیے میں ہر طرح سے محتاط تھا۔

اور ابراہیم۔۔۔۔۔۔ ہاں! بھئی اس میں کیا شک ہو سکتا ہے اسے۔۔۔۔۔۔ سفید رنگ، ہی

مرغوب ہوسکتا تھا۔ سفید رنگ ــــــــ جو اپنی تمام تر قوسِ قزح لیے اس کی عرفانی طبیعت میں چھپا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کے پاس بیٹھنے کے بعد انسان اس کے جسم سے نا آشنا ہو کر اس کی روح سے محوِ گفتگو دکھائی دیتا۔ بلکہ کچھ دیر میں اس کا اپنا جسم بھی فضا میں تحلیل ہونے لگتا اور وہ "اِن ویزی بل" ہو جاتا۔

بس یہ محض اتفاق تھا جیسا کہ اکثر مغربی ممالک میں ہوتا ہی ہے، کہ ضرورت! ــــــــ کہ ہم چاروں ایک چھت تلے اطمینان اور چین سے گزر بسر کر رہے تھے۔ ہم اسے بھائی چارہ کہتے یا مجبوری مگر ہمارے پاس فی الوقت کوئی چارہ نہ تھا۔ کیوں کہ ہم میں سے کوئی اچھی طرح اپنے پیروں پر کھڑا نہیں تھا۔

اپارٹمنٹ کے کرایہ کا چوتھا حصہ جو ہم سب کے حصوں میں، گروسری کے علاوہ تھا، برابر برابر آیا تھا، جس کی وجہ سے ہم اپنے اپنے اخراجات سنبھالتے ہوئے، اپنے اپنے خاندانوں کو سپورٹ بھی کر لیا کرتے۔

ابھی ہم میں سے کسی کے پاس بھی سیل فون تو تھا نہیں اس لیے بلڈنگ کے باہر سے ہی اندر موجود شخص کی موجودگی کا پتہ لینے کے لیے ہم نے "رومالوں" ہی سے کام چلا رکھا تھا، جس کی وجہ کو صحیح طور پر سمجھنا آسان بھی تھا اور مشکل بھی۔ مثلاً باسکٹ بال کھیلنے کے لئے ساتھی درکار ہو تو دور سے دیکھ لینا کوئی ہے یا نہیں ــــــــ رامو گھر ہوتا تو رومال بتا دیتا کہ ضروری چیزوں کی خریداری ہو چکی ہو گی ــــــــ مگر یہ رومال ہی سب سے بڑا دھوکہ بھی تھا۔ انسانوں کی طرح کا دھوکہ جو اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ ہوتے ہیں ــــــــ مثلاً کبھی کبھی رامو کا رومال تو ہوتا مگر رامو ہوتا اپنے رشتے کی آنٹی کے ہاں! اور کبھی کبھی ڈیو، پری کے چکر میں جیسے وہ چپکے سے پھنسا کر لایا ہوتا، بالکنی میں "لال جھنڈی" لگانا ہی بھول جاتا۔

کبھی میرا سبز رومال جسے میں جان بوجھ کر وہیں لگا رہنے دیتا، دیکھ کر ڈیو اپنا ارادہ بدل لیتا اور کبھی میں سفید رومال، اپنے موٹے شیشوں کی اوٹ سے نہ دیکھ پا کر ابراہیم کی کمپنی مس کر دیتا۔ ورنہ اکثر لال اور نیلے رنگ کی وجہ سے میں کچھ اور دیر Mall میں بلاوجہ گھومتا رہتا۔

حالات جیسے بھی ہوتے ہم ایک دوسرے کا لحاظ اور احترام نہ چھوڑتے، شاید اس لئے کہ ہم ایک ایسے ملک کی چھت تلے تھے جہاں انسان کے بنیادی حقوق ایک "تصور" کئے جاتے تھے اور بظاہر عمل درآمد بھی نظر آ جاتا تھا۔ اور خاص طور پر "گروسری" کی خریداری کے دن ہمارا اتحاد، عروج پر ہوتا ہمارے پاس حلال، حرام کے جھگڑے سے زیادہ پسند نہ پسند کی مشکل تھی اور اس

سے بھی بڑی "مشکل" دیکھ کر "سستی ترین" ڈیل حاصل کرتا تھا اور ہم مساوی حقوق والے ماحول میں ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

یا پھر یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ ہمارا ساتھ چند گھڑیوں ہی کا تھا۔ ہم ریل کے ایسے ڈبے تھے جو محض اتفاقیہ طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور ایک نہ ایک دن الگ ہونے والے تھے۔۔۔۔۔شاید بہت جلد اور ہم ایک دوسرے پر احسان کر رہے تھے یا احسان مند ہو رہے۔۔۔۔۔۔یہ سوال ذرا مشکل تھا۔

رامیش کو اچھی جگہ کمپیوٹر جاب کی امید تھی۔ پھر وہ مستقل طور پر اپنی آنٹی کے ہاں منتقل ہونے والا تھا۔ ڈیوڈ Dental Assistant کا امتحان دے رہا تھا۔ ابراہیم Physio therapist بننے کے آخری سال میں تھا۔ اور مجھے Criminology کا ڈپلومہ کر کے گھر کا رخ کرنا تھا۔۔۔۔۔امریکہ کے ایک دوسرے شہر۔۔۔۔۔اور بس چل سو چل!

☆☆☆

پتہ نہیں کیوں، کب اور کیسے میں ابراہیم کا مرید ہوتا جا رہا تھا۔ علم و مرتبہ کے علاوہ عام معاملات میں بھی مجھے ابراہیم کی شفاف۔۔۔۔۔کرسٹل کلیئر شخصیت غیر جانبدارانہ اور صوفیانہ خیالات بہت متاثر کرتے۔ اسی لیے میری دوستی، یقینی نہیں تو ناگزیر ضرور تھی۔

میں ہمیشہ اس کوشش میں ہوتا کہ وہ مجھے اکیلا مل جائے اور جب ابراہیم مجھے اکیلا مل جاتا تو ہم کہانیاں سناتے۔ ایک دوسرے کو! حضرت آدمؑ کی کہانی سے لے کر حضرت ابراہیمؑ کی کہانی تک، حضرت ابراہیمؑ کی کہانی سے لے کر حضرت محمدؐ کی کہانی تک۔ دنیا کی پیدائش اور قیامت تک کی کہانیاں، دنیا کی تہذیبوں پر مذاہب کے اثرات کی کہانیاں، مذہب کی تعلیم پر دنیا کے رنگ کی کہانیاں، انسان کے عقیدے اور عمل کے تضاد کی کہانیاں۔۔۔۔۔

اور کبھی رامیش اور ڈیوڈ بھی آ جاتے تو کبھی رام کتھا چل نکلتی اور کبھی مہا بھارت کا قصہ کھل جاتا۔۔۔۔۔حضرت موسیٰؑ کا رعب اور حضرت عیسیٰؑ کی عاجزی منظر عام پر نکل آتی۔

اور بدھا اور کنفیوشس کو بھی ہم کبھی نہ بھولتے! ہمارا مقصد مقابلہ نہیں تھا۔۔۔۔۔۔تجزیہ تھا۔

مل کر ہم نے یہ جان لیا تھا کہ دنیا صرف "عدل" کے اصول پر قائم ہے۔ شروع سے اخیر تک بنانے والے نے ایک ہی "پیغام" دیا ہے۔۔۔۔۔'سلامتی کا پیغام۔۔۔۔۔اتنا اچھا، اتنا پیارا پیغام، اتنا آسان اور سادہ سا امتحان،۔۔۔۔۔اتنی تھوڑی اور چھوٹی امید!۔۔۔۔۔انسانیت کے نام۔۔۔۔۔انسان بننے کا پیغام! انسان جسے ایک خدا نے ظاہری

رنگت اور مختلف علاقائیت کے چوکٹوں میں جکڑ دیا ہے۔ مگر اس کی جسمانی اور روحانی اصلیت صرف ایک ہے۔۔۔۔۔۔اور آزاد ہے۔ اگر کوئی اسے جکڑ سکتا ہے تو وہ ہے ایک خدا کا حکم، جس کے آگے سبھی کو جھکنا ہے اور ہزاروں نبیوں اور اللہ کے بندوں کو یہی حکم یاد دلانے کے لئے اللہ تعالی نے بار بار بھیجا۔۔۔حکم۔۔اللہ، اصول۔۔۔عدل اور پیغام۔۔۔۔۔۔امن اور سلامتی!

مگر کسے یاد رہتا ہے کچھ۔۔۔۔آج مذاہب کی تعلیم کی ایک دوسرے پر فضلیت ثابت کرنے کی جستجو میں لڑائیاں لڑنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کب اور کہاں ''امن'' کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ اور پھر ایک آدم کی اولاد، قابیلؑ کی طرح سوچتے رہتے ہیں کہ ہابیل کو کہاں دفن کریں؟

اور کوے جیسا ایک ''جانور''۔۔۔ایک ''پرند'' انہیں ''عقل'' سکھانے کیلئے مقرر کر دیا جاتا ہے۔

حسرت ہے ایسی انسانیت کے نام پر۔۔۔۔۔۔! جو یہ نہیں جان سکے کہ انسانوں کی سلامتی خطرے میں ڈالنے سے تعلیم کی برتری ثابت نہیں کی جا سکتی۔۔۔مگر صرف تعلیم پر عمل کرنے سے ہی ''تعلیم'' کو سچا کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔۔۔جس کا ''معیار'' اب بھی بہترین اخلاق ہی ہے۔

اور خدا، جو رب العالمین ہے، صرف رب المسلمین نہیں، کی صفات، کسی مخصوص عدد سے کہیں زیادہ ہیں اور اسی کے کلام میں موجود ہیں جسے ہم نہ پڑھتے ہیں اور نہ پڑھنے دیتے ہیں۔ کیونکہ ہماری کم عقلی نے، خود ہمیں بھی اس عالمگیر پیغام کا حقدار ہی رہنے نہیں دیا جو سب کو یاایہاالناس کہہ کر پکار رہا ہے۔

☆☆☆

ہم چاروں میں کچھ ایسی ہی آہنگی پیدا ہوتی جا رہی تھی جو بیان سے باہر تھی۔

ہم نے خیالات کے تبادے کے ارادے سے ایک مشہور انٹرنیشنل ''اسلامی فورم'' میں حصہ لے لیا، جہاں دیگر مذاہب کے لوگ مل کر سوالات و جوابات کے ذریعے نا صرف ایک دوسرے کی مذہبی تعلیم جاننے کی کوشش کرتے بلکہ افہام و تفہیم کی صورت نکالنے کی بھی۔۔۔۔۔۔

جہاں اور کوئی فرق نمایاں ہو یا نہیں۔۔۔۔۔۔مگر، امن پسندوں کے لئے ''کامن ٹرمز'' پر فیصلہ کرنے کی قرآنی دلیل ضرور موجود تھی۔ وہیں شر پسندوں کی کم علمی اور ''تعصب پسندی'' کے باعث، فورم کو میدان جنگ میں تبدیل ہونے میں دیر نہ لگتی اور پھر اچھے بھلے ''ٹاپک'' کا تھریڈ، ناپسندیدہ الفاظ اور ''ایموشن آئکنز'' جیسے ہتھیاروں کا اکھاڑہ بن جاتا۔ کشتیاں شروع ہو جاتیں۔

اور میں تو بس سوچتا ہی رہ جاتا کہ اگر یہ ''فرضی لوگ'' حقیقت میں ایک دوسرے کے مدمقابل آ کھڑے ہوں تو کیا کریں گے؟

☆☆☆

فورم پر صرف دماغ ہی دماغ تھے، سوچ ہی سوچ، نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا۔۔۔۔۔۔نہ مرد نہ عورت۔۔۔۔۔۔پھر بھی۔۔۔۔۔۔یہ حال کہ بس انا اللہ۔۔۔۔۔۔بس فرق صرف اتنا تھا کہ خوامخواہ کا علم جھاڑنے والوں کی پہچان، غرور اور تکبر تھی اور اصل علم جاننے والوں کی پہچان، بردباری اور عاجزی!

باقی سب کے سب ''کم علم'' یا تو خاموش تماشائی بنے رہتے جو مقابلوں میں نظر آئے بغیر شریک ہوتے، مزے لیتے یا پھر علم حاصل کرتے رہتے۔ کچھ Good Post کہہ کر شامل ہو جاتے اور کچھ ایسا تبصرہ کر ڈالتے کہ پوری فورم برادری مشتعل ہو جاتی اور ایسی صورت حال میں کوئی Moderator کچھ نہ کر پاتا اور پھر شاید Administrator ''اقوام متحدہ'' کے فیصلے پر Anti Spammer کی مدد سے زیادہ Offensive posts سرے سے Delete کر ڈالتے۔

دراصل لوگ ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ جھولا تو دو Extremes کے بیچ ہی جھولتا ہے اور Absolute Perfection تو بس اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اور Absolute Imperfection پر شیطان کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اس سفید اور سیاہ کے درمیان کئی طرح کے Tints اور Shades ہیں۔۔۔۔۔۔انسانوں کے رنگ، انسانیت کے رنگ۔۔۔

ہم چاروں نے اپنے اپنے نام بھی رومالوں کے سگنلوں جیسے رکھ چھوڑے تھے۔ آپ بھی پہچان جائیں گے کہ کون کون تھا۔۔۔۔۔۔

Green Flag, Blue Heart, Red Star۔۔۔۔۔۔اور White Horse

اور ناموں کو ظاہر کرنے والے Avatar ہماری پہچان تھے۔ یعنی سرخ ستارہ تو جلتا بجھتا تھا، نیلے دل میں نیلے شعلے جل رہے تھے، سبز جھنڈے پر سفید ستارہ تھا اور سفید گھوڑے پر ایک knight سوار تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ ہم کہیں بھی ہوں۔۔۔۔۔۔شریک رہیں۔

فورم پر اکثر Threads کسی ''فیصلے'' کے بغیر ہی ختم ہو جاتے، جیسے اکثر افسانے کچھ سمجھائے بغیر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

مثلاً اکثر لوگ وہی کرتے جو اکثر لوگ کرتے ہیں یعنی اکثریت قرآن وسنت کے دلائل، بائبل کے حوالے، گیتا کی یاترا، سبھی بے کار جاتی اور تلاش' کرنے والے ''منزل'' پائے بغیر ہی دم ہار کر اپنی اپنی کرسیوں پر آ بیٹھتے، جیسے کرسی نہ چھوڑنا جھوٹی ''انا'' کا مسئلہ ہو اور ''سچ'' ''انا'' کے بت

کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو۔

دراصل قصور ان بے چاروں کا نہیں تھا۔ اللہ ہی نے اپنے حکم کے مطابق ایسے ذہنوں پر ایسے ہی عالم مقرر کر رکھے تھے۔ جنہیں خود بھی علم اور جاہلیت، کا فرق معلوم نہیں تھا۔ ان کے پاس اپنا ہی تیار کردہ وہ ''حلوہ'' تھا جو وہ اللہ اور رسولؐ کے نام پر لوگوں کو کھلانے پر مجبور کرتے اور نفرت کے بت کی پرستش میں انڈا بیچو، جوتا لو، والی سیاست کی پرشاد بانٹتے تھے۔

یہ وہی تھے جن کے دماغ کمپیوٹر کی CPU کی طرح تھے۔ جن کے Search Engines حوالے تلاش تو کر سکتے ہیں مگر اس Information کو Process کر کے Knowledge نہیں بنا سکتے۔ اسی لیے تو سب کھایا پیا، نکل جاتا اور Assimilate ہو کر جسم کا حصہ بنتا نہ توانائی!

وہ سب مرغے کی ایک ٹانگ پر لڑکھڑا رہے تھے جن کی دجال کی بائیں، دنیا پرست آنکھ کھلی تھی مگر روحانیت اور ہدایت والی دائیں نگاہ بجھی ہوئی تھی۔ جو خود جہالت کے ایسے گدھے پر سوار تھا جو خانہ کعبہ کا چکر لگانے کے بعد بھی گدھے کا گدھا ہی رہتا ہے!------شاید ایسا ہی گدھا ہم بھی تھے جو کتابوں سے لدا ہوا ہوتا ہے------شاید ان سب کی طرح ہم بھی اپنی اپنی Kaliedoscopes کے اندر ہی جھانک رہے تھے اور رنگوں کے امتزاج سے بننے والے نت نئے ڈیزائنوں کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔

بس ہم بھی، جوان طبقے کی طرح، جو بن آتا کرتے------نبھاتے نہ تھے۔ بہت سے لوگ Topic کو چھوڑ بھاگتے اور کوئی انہیں پکڑنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ نہ پکڑ سکتا۔ کچھ تو Forum ہی سے غائب ہی ہو جاتے۔ جیسے کبھی وہاں تھے ہی نہیں۔

☆☆☆

فورم سے ہٹتے اور ہم ابراہیم کے ''دوالے'' ہو جاتے۔ ہماری بحث کی Palette پر صرف ایک رنگ نمایاں رہتا------سفید------جیسے آرٹسٹ کی White Tube جو کہیں نہ کہیں استعمال ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ یہی رنگ وہ سب سے زیادہ استعمال بھی کرتا ہے۔

ابراہیم کو چھوڑ کر بھاگنا ممکن نہیں تھا اور یہ بھی صاف تھا کہ اس کے سفید رنگ سے مل کر ہمارے سبھی رنگ بھی پھیکے پڑ جاتے۔ مگر ہم بھی ظاہر نہ ہونے دیتے کہ اس کے ''روحانی اثر'' سے ہمارے '' جسم'' غائب ہو رہے ہیں۔

رامیش اور ڈیوڈ کے بارے میں تو میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں عدل پسند ہوتے

ہوئے بھی تھوڑا سا انا پرست ضرور تھا اور متعصب نہیں تو Allergic ضرور تھا۔ اس لیے میں ابراہیم کی غیر موجودگی میں انہیں Awoid کرتا رہتا۔

پھر بھی ۔۔۔۔۔۔ میرا حال یہ تھا کہ میرے سبز جھنڈے کا سفید ستارہ ۔۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ چاند بنتا جا رہا تھا۔ جس میں ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی بھی تھی اور "موغیت" بھی!

ابراہیم کے ذہن سے پھوٹنے والی روشنی۔ جس کی خوبی یہ تھی کہ اس کے مقابلے میں ذہنوں میں جلنے والی ہر آگ بجھ جاتی تھی ۔۔۔۔۔۔

کیوں کہ وہ بجھا ڈالتا تھا۔ وہ جلتی پر تیل نہیں ڈالتا تھا۔

ابراہیم ۔۔۔۔۔۔ کتنا مختلف تھا وہ ۔۔۔۔۔۔

وہ کوئی بے تاج ۔۔۔۔۔۔ بادشاہ تھا۔ جس کے پاس "عالمیت" کا عہدہ نہیں تھا، پھر بھی وہ سچا عالم تھا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا ۔۔۔۔۔۔ مگر اس کے نام کے ساتھ محمدؐ، احمدؐ، علیؓ، ملک، بٹ، شیخ ۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی تو جڑا نہیں تھا۔ جڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ خطیب کی طرح چلائے بغیر ہی اللہ رسولؐ کا عشق پھیلا رہا تھا۔ وہ کسی دعوئی جماعت کا ممبر ہوئے بغیر ہی مبلغ اسلام تھا، وہ چندے اکٹھے نہیں کرتا تھا، حکمت بانٹتا تھا۔

وہ مختلف ہی تو تھا۔ اس کا حلیہ نہیں، عمل متاثر کرتا تھا۔ وہ نوبل پرائز یافتہ تو نہیں تھا مگر پکا Humanitarian تھا۔

وہ مختلف تھا۔ کیونکہ علم نے اس کا سر بلند نہیں کیا تھا ۔۔۔۔۔۔ بلکہ اور جھکا ڈالا تھا ۔۔۔۔۔۔

وہی ابراہیم ۔۔۔۔۔۔ جو کہا کرتا تھا۔ اس دنیا میں سبھی ابراہیم ہیں ۔۔۔۔۔۔ سب کو اپنا خدا ۔۔۔۔۔۔ خود تلاش کرنا ہوگا! مگر ایک ہی کعبہ بنانا ہوگا۔

کتنا رعب تھا اس کا، پتہ نہیں کیوں رامیش اپنے بھگوان کی چھوٹی سی مورتی چھپا چھپا رکھتا کہ کہیں ابراہیم اسے توڑ نہ ڈالے اور پھر کلہاڑا بھی اسی کے کندھے پر نہ رکھ دے۔

کتنا رعب تھا اس کا کہ ڈیوڈ ۔۔۔۔۔۔ صلیب سامنے لے کر ہی نہیں آیا۔ نہ اپارٹمنٹ میں ۔۔۔۔۔۔ نہ سینے پر۔ جیسے عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بنانے والا وہی پہلا آدمی ہو۔

جب وہ بڑے بڑے مسئلوں کے آسان اور سادہ جواب دے کر "دین فطرت" کے صحیح معنی اجاگر کرتا تو یوں لگتا جیسے علم ابھی پیدا ہوا ہے اور دنیا کی اوڑھنی میں لپٹا ہوئے ہمارے سامنے کلکاریاں لے رہا ہے۔

ایسے وقت میں وہ خود بھی وہی ننھا بچہ دکھائی دیتا، جیسا وہ اپنے بچپن کے قصوں میں تھا۔ جو کبھی

کبھی وہ ہم سے Share کیا کرتا! کسی ماہر قصہ گو کی طرح!

جیسے ایک روز جب مغرب کے وقت ایک خوش الحان، موذن کی اذان کے ختم ہوتے ہی یکدم قریبی مسجدوں کے لاؤڈ سپیکروں نے اذانوں کی یلغار کردی تو پانچ چھ برس کے کم سن ابراہیم نے پہلو میں کھڑی ماں سے کہا تھا۔

''امی جی، اچھے بھلے اللہ میاں بول رہے تھے پتہ نہیں کیوں مولویوں نے اذانیں دینا شروع کردیں!''

وہی تو ابراہیم تھا جو ہر ''عربی'' کو ''محمدؐ'' سمجھتا اور پھر نا جانے کتنی ہی دیر وہ اسلامیات کی جماعت میں بار بار دہرائے جانے والے لفظ ''مومن'' کو بجلی کا بلب ہی سمجھتا رہا تھا۔

وہی بھولا بھالا ابراہیم جو معصوم تھا ـــــــــ احمق نہیں ـــــــــ اس آزاد بے راہ روا مغربی ملکوں کی خاموشی میں جہاں اذانوں کی آواز تک سنائی نہیں دی، ایسے ایسے رازوں کی سرگوشی جان گیا تھا جو شاید مشرق میں رہنے والے اذانوں کے غل میں سن نہیں پاتے۔

☆☆☆

مغرب میں عقیدے اور عمل کے اختلاف کو انا کا سہارا نہیں ملتا تھا۔ جہاں ہر مسلمان اقلیت میں تھا مگر اسلام قبول کرنے والوں کی شرح شاید بہت سے مسلمان ممالک سے زیادہ تھی جہاں ایسا ہی لگ رہا تھا کہ مغربیوں کا سورج تو مشرق سے طلوع ہوتا ہی ہے مگر شاید پرانی پیشگوئیوں کے مطابق، مشرقیوں کا سورج مغرب سے طلوع ہونے لگا تھا۔ آخر کیوں؟ ـــــــ

اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ الگ بنانے والے، حج کے موقع پر ایک ہی جگہ، ایک ہی امام کے پیچھے، ایک ہی خدا کے آگے جھک جھک جاتے اور واپس آ کر اتحاد کے تمام تر سبق بھلا کر پھر، اپنی اپنی کتابیں پڑھنے لگتے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کوئی ان پر ہنس رہا ہے۔

ہاں! وہ لوگ بھی تھے جن میں ہم آہنگی کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنے کی دھن سوار تھی مگر ان پر یہ الزام عائد ہو جاتا کہ وہ مذہب کے جسم پر تصوف کے ''پر'' لگا کر اسے اپنی جگہ سے ''اڑا'' دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود یہ بھول رہے تھے کہ اب تک ثریا سے، ایمان کو بار بار، زمین پر اتارنے والے لوگ کون تھے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر صدی نے ''خوش آمدید'' کیا مگر انسان جو قبروں کو پوجنے کے عادی ہیں، انہیں پہچان بھی نہ پائے اور نہ ہی اس ''ایمان'' کو سمجھ پائے جو مچلے ہوئے بچے کی طرح بار بار ''اٹھ'' جانے کی ضد کرتا ہے۔

حالانکہ صوفی کا تصور ہی وہ طاقت ہے جو انسان کو مادیت کے جنگل سے نکال کر کھلی فضا میں لے

آتی ہے۔ وہ وجدان ہے جو روح کو رب سے ملا دیتا ہے اور جسم کی ہر کشش سے آزاد کرا دیتا ہے۔
یہی وہ تصور ہے جو تعصبات اور منافقت کے ظلم کے، شدت پر پہنچ جانے کے بعد ہی پیدا ہوا کرتا ہے۔ اسی "نفس صحیحہ" پر جس پر دنیا میں آنے والا ہر بچہ پیدا ہوا کرتا ہے اور خون سے رنگی دنیا کے چہرے کو انسانیت کے پانی سے دھونے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جھوٹ میں خوش رہنے والی دنیا کو اس جنت کے تصور سے کیا لینا دینا جو اس نے دیکھی ہی نہیں ــــــ پتہ نہیں جو ہے بھی یا نہیں۔
ظالم کا دل تو پتھر کا بن جایا کرتا ہے۔
ہم بھی تو یہی کرتے۔ اپنی اپنی جگہ آ کر پتھر کے بت بن جاتے۔ اپنی اپنی انا کے خول میں واپس لوٹ آتے ہی سکون سا مل جاتا اور ہم سب اس خول کے لحاف جیسے ماحول میں تھپک تھپک اپنا جسم سلانے کی کوشش کرنے لگتے ــــــ
مگر روح بے چین ہو جاتی!

☆☆☆

اپنی اپنی ڈگر پر چلتے چلتے پتہ نہیں چلا کہ کب کتنا وقت بیت گیا اور جدائی کا گھڑی نے ہم چاروں کو پیلا رومال دکھا دیا۔
اور پھر ایک روز ہم چاروں، چار سمتوں کی طرح جدا ہو گئے اور قبلہ درمیان میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا، اکیلا!
پہلے رامیش گیا پھر ڈیوڈ بھی۔ کچھ عرصے ابراہیم کی خاطر میں نے اپارٹمنٹ کا نصف کرایہ دینا بھی برداشت کر لیا تھا۔ لیکن جب ابراہیم بھی چلا گیا تو میں کچھ عرصہ کے لئے Bachelors میں چلا گیا۔ کسی نئی Company کا رسک لینا، اس ڈیپریشن میں ممکن نہ تھا، جو مجھے لاحق ہو گیا تھا۔
بس جیسے تیسے دن گزرنے لگے۔
پھر ایک دن ایسا آیا کہ ابراہیم سے ملاقات کا وسیلہ، فقط کمپیوٹر رہ گیا، کبھی Messager کبھی Email اور کبھی ـــ وہی پرانی محفل ـــ یعنی فورم کبھی کبھی Redstar اور Blue Heart بھی وہی دکھائی دیتے ورنہ۔ وہ تو ایک شہر میں ہو کر بھی فون تک نہیں کرتے۔ جس کی وجہ شاید میری ہی Allergy تھی جو دونوں نے بھانپ لی تھی۔ پتہ نہیں ابراہیم سے بھی ان کا رابطہ تھا یا نہیں۔
فورم پر پہنچ کر میرا ڈیپریشن کچھ کم ہونے لگتا۔

وہی تجسس۔۔۔۔ابراہیم کی Posts پڑھنے کا۔کبھی کبھی میں اس کی توجہ Reasoning کی خداداد صلاحیت سے اس قدر متاثر ہوتا کہ جی چاہتا کہ اس کہوں "پیر جی! میری بیعت قبول کرو" مگر اور کچھ ہو نہ ہو صاف دل ابراہیم پر نیا فرقہ بنانے کا الزام ضرور لگ جاتا اور الزام لگتا تو ابراہیم کے ذہن میں روشن بلب بھی بجھ جاتا۔وہ بلب جس میں گرمائی نہیں تھی۔۔۔بس روشنی تھی۔۔۔نور تھا۔

☆☆☆

پھر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ابراہیم مشرق میں لوٹ گیا، جہاں نور کو سمجھنے والے کم اور نفرت کی جنگ کی سردی، گرمی کو پہچاننے والے زیادہ تھے۔جہاں الزام لگانا اور جرم ثابت کرنا روز کا مشغلہ تھا۔

جہاں، آج بھی، مذہب ایک مقابلہ ہے۔اسی مقابلے نے اصل مذہب کی شکل رسموں اور بدعتوں نے مسخ کرر کھی ہے اور روز بروز زمانے کے ساتھ چلنے کا بہانہ بناتے ہوئے دین فطرت پر سجاوٹ اور بناوٹ کی فضولیات کا "میک اپ" چڑھایا جارہا ہے۔

مگر ابراہیم اپنی ہی ٹھنڈک میں مست و مجذوب رہتا تھا۔"جبر نہیں" جبر اللہ کا دین نہیں ،مرضی ہے۔اسی اصول پر تو اس نے بندوں کو گروہوں میں بانٹ رکھا ہے کہ وہ گروہ پہچانتے ہیں یا مجھے !وہ جھوٹوں ظالموں کو ڈھیل اور سچوں اور مظلوموں کو تکلیف دے کر آزماتا ہے۔

اور پھر ایک دن ایسی ہی آزمائش نے ایک روز ابراہیم کو گھیر لیا۔ایسے ہی ایک امتحان نے ابراہیم کے دماغ میں نصب شدہ ترازو کو ہلا دیا۔وہ عدل جو پیدائشی طور پر اس کی Genes کے Blue Print میں چھپا ہوا تھا۔فطرت صحیحہ کا ترازو۔ایسا واقعہ جس نے اس کے DNA کی Helix Chain کو عدل جہانگیری والی زنجیر سمجھ کر کھینچنا شروع کر دیا۔

اسی کھینچ تان میں ابراہیم کے دماغ میں 'لوڈ شیڈنگ' شروع ہوگئی۔جس کا ذکر ایک روز بذریعہ ای میل اس نے مجھ سے کیا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں Fuse نہ ہو جائے۔

ہوا یوں کہ ابراہیم کے والد، جو آتش پرست تو نہ تھے، مگر ان کے اندر ہمیشہ ایک نفرت کی آگ سلگتی رہتی تھی، نے ابراہیم کو آزمائش میں ڈال دیا۔

وہ ایک مشہور مسجد میں خطیب کی گدی سنبھالے ہوئے تھے مگر کبھی کبھی شوق اور غصہ میں وہ اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لیا کرتے تھے، اُن کو چند بے وقوف لوگوں نے بھڑکا دیا اور "کچھ کرنے" پر اکسانے کی کوشش کی۔

والد صاحب تو عادت سے مجبور تھے۔مگر ابراہیم جو ٹھنڈے ملک، کی امن پسندانہ ٹریننگ کے

بعد، گرم ماحول کی اس تربیت سے پہلے ہی دل برداشتہ تھا، کچھ زیادہ ہی مایوس ہو گیا۔

والدہ حیات ہوتیں تو شاید اور بات ہوتی۔ مگر ان حالات میں ابراہیم، جو اکلوتا بیٹا بھی تھا اور طبیب بھی۔ عجیب مخمصے بھی پھنس گیا۔ مگر اصل بات نہ سمجھتے ہوئے میں صرف یہ مشورہ ہی دے پایا کہ یار مجھے یقین ہے تو جو کرے گا ٹھیک کرے گا سو خود پر یقین رکھ۔ تو تو روح کا ڈاکٹر ہے Spiritual Therapist!

مگر ابراہیم، جو اپاہج انسانوں اور انسانیت دونوں کا علاج کرنے کے لئے بے چین تھا، اسے قتل پر اکسایا جانے لگا۔

نفرتوں کی آگ میں جلنے اور جلانے والوں کا Plan ایک غیر مذہب فیملی کا گھر جلانے کا تھا۔ جو پشتوں سے محلے دار تھے۔

اپنے محتاط ترین رویے کے باوجود وہ ایسی سازش میں پھنس چکے تھے جس کے باعث محلہ داری میں رنجش پیدا ہو رہی تھی اور اب وقت آ گیا تھا کہ محلے کو "پاک" کر دیا جائے۔

سو جہاد کے نام پر چند جوشیلے نوجوانوں کو جو دن میں گلی کی نکر پر فلمی گانے گا کر اور آتی جاتی لڑکیوں پر آوازیں کس کر اور پھر رات کو میوزک بینڈ بنانے کے پلان بنا کر اپنا جوش ٹھنڈا کرتے رہتے، کو "راضی" کر لیا گیا۔ ویسے بھی وہ جو دین سے کنارہ کش تھے، مگر دنیا میں عملی جوہر دکھانے کے لئے سخت بے چین انہیں اور چاہئے ہی کیا تھا۔

مشن کی تیاری کا وقت قبل از فجر تھا۔ ابراہیم پر والد کا مرتبہ، رعب اور جبر مسلط تھا اور اسے قافلے کے ساتھ جانا تھا۔

میں اس کی ذہنی حالت کا اندازہ ہی لگا سکتا ہوں جو اس کے ہر رابطے میں عدم موجودگی سے ظاہر تھا۔ مگر اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اور پھر وہ گیا۔ ان کے ساتھ مگر جلانے نہیں، بچانے۔۔۔۔۔۔ اس نے پہلے بوڑھے والدین کو بچایا پھر ان کے بیٹے اور بہو کو اور پھر ان کے اکلوتے پوتے کو بھی۔۔۔۔۔۔ مگر بچے کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے اسے اچانک ہی کارنس پر پڑی ایک کتاب دکھائی دی۔۔۔۔۔۔ دیگر مذہبی کتابوں سے الگ پڑھا ہوا۔۔۔۔۔۔ "قرآن"۔۔۔! بچے کو باہر نکالنے کے بعد وہ بھاگتا ہوا اندر دوڑا۔۔۔۔۔۔ قرآن اٹھایا اور تیزی سے باہر نکلنے لگا۔ اچانک اس کا سر زوردار طریقے سے کھڑکی کے پٹ سے جا ٹکرایا۔ وہ گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

آگ پھیلتی گئی۔ وہ زمین پر بے ہوش پڑا رہا۔ کسی نے اندر آنے کی جرات نہ کی۔ اسے بچانے کی فکر نہ کی۔

وہ جل گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے سینے پر پڑا ہوا نسخہ "قرآن بھی! عرصے تک یہ خبر مشرقی اور مغربی اخباروں کی شہ سرخی بنی رہی۔ تصدیق کے بعد میں سکتے میں آ گیا۔

☆☆☆

انہی دنوں ایک دن رامیش اور ڈیوڈ مجھے ملنے آئے۔ پتہ نہیں کب ان دونوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہم کچھ زیادہ کہے سنے بغیر آنسو بہانے لگے۔ ہماری زبانیں بند تھیں اور ذہن قبر کی طرح کھلے ہوئے تھے جس میں ابراہیم کی معیت، سفید، بے داغ کفن میں ملبوس پڑی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے الماری سے وہ تمام رومال نکال لایا جو میں نے اب تک "نشانی" کے طور پر سنبھال رکھے تھے۔

ہم سب نے ابراہیم کا سفید رومال، آنسوؤں میں بھگو ڈالا اور پاگلوں کی طرح ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ مگر کسی نے کسی سے یہ نہیں پوچھا کہ تہجد کے وقت نچلے عرش پر آئے ہوئے خدا نے یہ تماشہ کس طرح برداشت کیا۔

نمرود جیسی دنیا! کی لگائی ہوئی آگ گل گلزار کیوں نہیں ہوئی۔

آج کے اس ابراہیم۔۔۔ا کے لئے کوئی معجزہ کیوں نہیں ہوا۔

اس ابراہیم کے لئے جس نے دوسرے کی اکلوتی اولاد بچاتے بچاتے اپنی جانی قربان کر ڈالی۔

ہم نے مل کر فورم کھولا۔ جس میں ایک Thread میں "مسلمان کی تعریف" زیر بحث تھی۔۔۔۔۔۔ایک دلیل قرآنی لکھ رکھی تھی۔

"اور ابراہیم، نہ یہودی تھا نہ عیسائی وہ تو اللہ کا بندہ! مسلمان تھا!"

اور ہمیں یوں لگا جیسے، سب نے مل کر قبلہ ہی توڑ ڈالا ہو۔

اوٹ

شایان ولا!۔۔۔۔۔۔۔ پھیلتے اندھیرے کی سیاہی میں ڈوبے درختوں کے گھنے سایوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی شایان ولا کی دودھیا عمارت کسی برتھ ڈے کیک کی طرح سجی سجائی دکھائی دے رہی تھی۔ اجلی اجلی کریم اور آئیسنگ جیسی رنگت پر رنگ برنگی جھنڈیوں اور ٹمٹماتی بتیوں کی سجاوٹ، عمارت کی غیر روایتی بناوٹ پر چار چاند لگا رہی تھی۔ کشادہ سی چھت پر، مشعلوں کی طرح، اجالا اٹھائے ہوئے، بازوؤں کی طرح خوش پوش، نازک ستون دور سے خوشنما موم بتیوں کی طرح کیک کی سطح پر گڑے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

عمارت کے اردگرد ایک بڑی ٹرے کی طرح پھیلا ہوا ہرا بھرا لان تھا، جسے پتھروں سے بنی مضبوط چاردیواری نے لوہے کے ایک گیٹ سمیت گھیر رکھا تھا۔ نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پوری عمارت کسی آسیبی طاقت کے قبضہ میں تھی۔

پوری عمارت پر "سیلی بریشن" کا سرور چھایا ہوا تھا۔ گیٹ پر کھڑے باوردی گارڈز اگرچہ بے جان مجسموں کی طرح جذبات سے عاری دکھائی دے رہے تھے مگر مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے مقرر کردہ کئی لوگ، قریب قریب ہی ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹیں سجائے، اِدھر سے اُدھر چہل قدمی میں مصروف تھے۔

شام ڈھلتے ہی مہمانوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے پہلے ہی سے ہاتھوں میں ٹھنڈے مشروبات کی ٹرے تھامے ملازمین جگہ جگہ موجود تھے۔ موسم کے مزاج کو بھانپتے ہوئے، سبز چائے کا انتظام بھی کیا گیا تھا تاکہ تقریب میں آنے کی "تیاری" سے تھک جانے والے مہمانوں کی تھکاوٹ، فوری طور پر دور کر دی جائے۔

لان میں پھیلی ہوئی آرام دہ کرسیاں، مایوس نظروں سے مہمانوں کی طرف تکتی جا رہی تھیں، جو اپنی تھکاوٹ چھپائے، کھڑے رہنے پر ہی مصر تھے اور مہمان تھے کہ بے خیالی میں بار بار، خالی

خالی سٹیج کو گھور رہے تھے، جس پر پڑا ہوا سامان کچھ بے جان سا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

نہیں نہیں، یہ کوئی عید یا شادی بیاہ سے متعلق، فنکشن نہیں تھا۔ البتہ گھر کے مالکان سمیت سبھی لوگ اس طرح سجے ہوئے تھے جیسے ''سجنا'' واجب ہو اور سجاوٹ بھی کچھ ایسی تھی، جس میں مشرقی تہذیب کی پہچان کم کم اور مغربی سٹائل کی نمائش زیادہ سے زیادہ تھی۔ حیا، بے باکیوں کی اوٹ میں سہمی کھڑی تھی!

کسی نادیدہ آسیبی سرور میں ڈوبی محفل میں شریک خواتین دکھا دکھا کر اور مرد حضرات دیکھ دیکھ کر محظوظ و مسرور تھے۔ جن میں جوان زیادہ اور عمر رسیدہ طبقہ کم کم تھا۔ بچے!۔۔۔۔۔۔ محفل میں بچے کہیں نہیں تھے۔ یہ تقریب ''بڑوں'' کی پارٹی تھی جس کا اہتمام کسی خاص سماجی، جس میں کئی سیاسی وجوہات اوٹ لیے ہوئے تھیں، کی بنا پر کیا گیا تھا۔ بظاہر ان پر اسرار وجوہات سے کوئی آگاہ نہ تھا۔

تقریبی کارروائی کی کوریج کے لیے چند اخباری رپورٹر بلانے پر اور کچھ بن بلائے ہی آ موجود تھے اور خاص طور پر دعوت میں مدعو ایکٹرسوں اور سرسری طور پر مہمانِ خصوصی جو خود بھی ایک پرانے ایکٹر ہی تھے، کے منتظر تھے۔

ان کے علاوہ پرائیویٹ مووی میکر بھی، جس کا اپنا زاویہ نظر کیمرے کے اینگل سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا، اپنی مختصر ٹیم کے ساتھ معروفِ عمل تھا۔

غیر مرئی فضا میں ریکارڈڈ میوزک کے سر بکھرے ہوئے تھے، جن کی علاقائی دھن ملک کے بیشتر علاقوں سے آئے ہوئے ان مہمانوں کے لیے نامانوس سی تھی، جو مغربی دھنوں کی دھن میں اپنی دھنیں بھولتے جا رہے تھے۔

وقت گزاری کی خاطر لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں شربت کا گلاس یا چائے کا کپ تھامے ہر واقف، ناواقف سے رسمی طور پر محوِ گفتگو دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ کی توجہ چہروں کے اتار چڑھاؤ پر تھی، کچھ کی نظر، لباس پر اور کچھ کی۔۔۔۔۔ لباس کے اندر!۔۔۔۔۔۔ کچھ تو دور ہی دور سے اور کچھ قریب قریب ہو کر کسی نامعلوم سرشاری میں مبتلا دکھائی دے رہے تھے۔

ہر طرف نظروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ جس کی اوٹ سے کسی شکاری کی بندوق کی نالی جھانک

رہی تھی۔نشانہ کب، کہاں، کیسے لگتا تھا کسی کو خبر نہ تھی۔

ایسے عجیب ماحول میں نہ تو غیریت ہی تھی، نہ اپنائیت ہی، کوئی اپنا تھا نہ پرایا، نا کوئی محرم تھا نہ نامحرم۔۔۔۔۔۔!

والدین کو اولادوں سے شکایت تھی نہ اولادوں کو والدین پر اعتراض، شوہروں کو بیویوں پہ شک تھا، نہ بیویوں کو شوہروں سے گلہ، بھائیوں میں بہنوں کے لیے غیریت تھی نہ بہنوں میں بھائیوں کا خوف اور لحاظ۔۔۔۔۔۔سبھی آسیب زدہ تھے۔

سب بندھنوں میں بندھے تھے۔مگر سبھی تو آزد ہے۔سب کچھ کھلا کھلا سا تھا۔سجا سجایا تھا۔ پلیٹوں میں دھرا تھا۔کوئی چکھے یا کھائے، کسی کو ہوش ہی کہاں تھا۔آنکھوں کے ساتھ ساتھ، عقل بھی چندھیا گئی تھی۔ یہ تقریب ہی برکت تھی۔ ہر کوئی بادلوں کے ساتھ، آسمانوں پر تیر رہا تھا۔ بھوتوں کی طرح!

☆☆☆

گہرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں دھنی ہوئی روئی جیسے اُجلے، ہلکے پھلکے بادل رواں دواں تھے۔زمین کی جھلملاہٹ کے اس ماحول میں تاروں سے بھرا آکاش بھی پھیکا پھیکا دکھائی دے رہا تھا۔ چاند بار بار بادلوں کی اوٹ لے کر اپنے چہرے سے شرمندگی کا پسینہ پونچھتا اور پھر اس جستجو میں نکل آتا کہ دیکھو بھلا! اَب آگے کیا ہونے والا ہے؟

خود اس کی اپنی حالت ایسی تھی کہ اتنے تاروں میں بھی وہ اکیلا اکیلا محسوس کر رہا تھا۔اتنی پررونق محفل کو دیکھ دیکھ کر بھی تنہائی اور گھبراہٹ کی کیفیت میں مبتلا تھا! بے چارا!

اچانک موسیقی تھم گئی۔گھر کے مالک نے سٹیج پر کھنکھارتے ہوئے حاضرین سے توجہ پانے کی درخواست کی اور مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے انہیں وہاں آنے کا مقصد یاد دلایا۔پھر باقاعدہ طور پر تقریب کا آغاز کرنے کے لیے رسم کے عین مطابق، قاری صاحب کو سٹیج پر مدعو کرنے کے بعد وہ سٹیج پر سے رخصت ہو گئے۔

قاری صاحب نامعلوم کیفیت کے تحت سر جھکائے، بغل میں قرآن کریم دبائے، چشمہ سنبھالتے ہوئے، قدیم حلیئے میں سٹیج پر تشریف لائے اور ڈائس پر قرآن کریم کی "پشت" لگانے کے بعد ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔

چاہتے، نہ چاہتے ہوئے بھی، چھوٹی شلوار قمیصوں والی خواتین نے چھوٹے ڈوپٹے، سر پر اس طرح لگا لیے کہ بالوں کا سٹائل متاثر نہ ہو پائے۔ مختصر بلاؤزوں والی ساڑھی پوش لیڈیز نے پلو کے کونے اور اونچی ٹاپس اور تنگ پتلونوں میں ملبوس لڑکیوں نے رومالوں سے کام چلا لیا اور پھر میک اپ سے بوجھل چہروں پر اداسی طاری کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو گئیں۔

کچھ مردوں نے داڑھی اور مونچھ کی "آؤٹ لائنوں" کے فریم کے اندر اور کچھ نے زنانہ سی مسکراہٹوں میں شرمندگی چھپاتے ہوئے سر جھکانے پر اکتفا کیا۔

چند سیدھے سادے حلیوں میں موجود مذہبی رجحان زدہ مخلوق نے بے خیالی میں سکھ کا سانس لیا اور مؤدب ہو گئے، جیسے حقیقت کی دنیا میں آ گئے ہوں۔

محفل پر کسی قسم کی ٹینشن طاری نہ ہونے پائے۔ اسی لیے خاص طور پر قاری صاحب کو سورۃ الرحمن کی تلاوت کی ہدایت دی گئی تھی جس میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ------فبای آلاء------کی تکرار کے ساتھ------اپنے رب کی نعمتیں گنوا گنوا کر اپنی "رحمانیت" جتلاتے ہوئے، بندے کو شکر گزاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

تلاوت کے دوران کچھ دیر تو شیطان بھی اپنے لیے "پناہ" کی تلاش میں لگ گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی نہ کوئی کونہ، کھدرہ تلاش کر ہی لیتا------تلاوت ختم ہو گئی۔

تلاوت و ترجمہ ختم ہوتے ہی سب نے------لمبی سی آہ بھری، جیسے اتنی دیر کسی غوطہ زن کی طرح سانس روکے پڑے ہوں۔

پتہ نہیں کیوں، سب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ قبروں سے باہر نکل آئے ہوں اور کسی نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا ہو۔ تسلی کے لیے کچھ نے کھسیانے پن کے ساتھ ایک دوسرے کے چہروں کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، فکر والی بات نہیں ہے------ابھی یہ زندگی ختم نہیں ہوئی، ابھی ہمارا ساتھ نہیں چھوٹا۔ ابھی دنیا باقی ہے، ابھی نعمتیں حاصل ہیں، ابھی رات نہیں ڈھلی!

اچانک ہی ایک غل برپا ہو گیا۔ قاری صاحب کچھ گھبرا کر سٹیج سے نیچے اتر گئے اور سیڑھیوں پر سے گرتے گرتے بچے۔ لگتا تھا انہیں کوئی آسیب نظر آ گیا ہو۔

تلاوت کے الٰہی سروں کے نشے میں گم، چاند بھی جو کچھ دیر کے لیے بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا، سہم کر جاتے ہوئے بادل کا ٹکڑا اچک کر، پھر سے چھپ گیا۔

☆☆☆

اور بس پھر وہ سماجی تقریب جو حقیقت میں کسی سیاسی مقصد کی ''مین ڈش'' کے ساتھ پیش کی جانے والی ''سائیڈ ڈش'' کی طرح تھی، کا باقاعدہ آغاز ''سلیڈ'' جیسی پھیکی تقریر کے ساتھ کیا گیا۔ پھر مہمان خصوصی نے، جو پرانے وقتوں کے مشہور ایکٹر رہ چکے تھے، نے سٹیج پر طلوع ہوتے ہی اپنا رنگ جما دیا۔ کچھ دیر کے لیے ماحول پر فلمی رنگ سا چھانے لگا۔

کچھ ہنسی مذاق، کچھ طنز و مزاح کے ذریعے خوش دلی کا تماشہ دکھانے اور رات کے کھانے کی دعوت کا باقاعدہ اعلان کرنے کے بعد وہ بھی ہولے ہولے چلتے ہوئے سٹیج سے اتر گئے اور فوراً ہی لوگوں کے ذہنوں پر سے بھی!

نئی موسیقی کی دھن پھر سے بلند ہوئی، مگر اب اس میں علاقائیت کی روح باقی نہ تھی اور حاضرین دھن کی لے پر چلتے چلتے میزوں کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ ہی آپ! فضا میں پلیٹوں، چمچوں، کانٹوں، چھریوں کے سُر بکھرنے لگے۔

اگر چہ دعوت کی مینیو (Menu) پر کسی قسم کی حکومتی پابندی کا کوئی اثر تو دکھائی نہیں دیتا تھا، مگر پھر بھی اکثر خواتین نے خود پر ڈائٹنگ کی پابندی لگا کر نوالے گننا شروع کر رکھے تھے۔ البتہ، بیشتر مرد حضرات، کوئی ''دوجا'' کام کرنے سے پہلے، فراغ دلی سے ''پیٹ پوجا'' میں لگ چکے تھے۔ درمیانے طبقے سے آئے ہوئے چند مہمانوں نے ''اگلی دعوت'' کی دوری کا اندازہ لگانے کے بعد، خوب پیٹ بھر کر کھالیا تھا اور رومالوں سے اچھی طرح منہ پونچھ کر دور کی کرسیوں پر جا بیٹھے، جیسے کھڑے رہنے سے ان کی ''چوری'' پکڑی جانے والی تھی۔ صرف ملازمین بچے تھے، جنہیں شاید، بچا کھچا، بال بچوں کے لیے لے جانے کی امید و انتظار میں صبح تک بھوکا رہنا تھا۔

یا پھر ''شایان ولا'' کے باہر جمع ہو جانے والے کشکول سنبھالے کچھ بھکاری اور بچے اٹھائے چند غریب عورتیں۔۔۔۔۔۔ جو بڑی دیر سے پتھرائے ہوئے باوردی اہل کاروں کو نا جانے کس امید میں خاموشی سے تکتے چلے جا رہے تھے کہ جیسے ان کے دیکھنے سے ان بڈاووں میں جان پڑ جائے گی۔

کھانے کے دور کے بعد، کچھ دیر کے لیے لوگ منتشر ہو گئے۔ کچھ خلال کے بہانے چھتوں پر چلے گئے، کچھ واش رومز میں گھس گئے، کچھ لان میں چہل قدمی کرنے لگے اور کچھ دور کی کرسیوں

اور درختوں کے سائے میں "تخلیہ" میسر آنے کی امید میں سرگرداں دکھائی دینے لگے۔
سب ہی کی کوشش تھی کہ تقریب کے ذریعے ملے موقع کے نتائج "دوررس" ہوسکیں۔
خوش گوئی کی اوٹ سے "نیک ارادے" جھانک رہے تھے۔ مگر کسی کو بھی قسمت آزمائی کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔
اچانک، دھماکے کے ساتھ ہی لائیو میوزک کا آغاز ہو گیا۔ سٹیج پر بڑے بڑے ساز و سامان میں چند چھچھورے لڑکوں کی آمد سے جان پڑ گئی، جو کسی ابھرتے ہوئے میوزک بینڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے لیے سب سے بڑا انعام ہی یہی تھا کہ ہر خاص و عام کی نظریں ان پر جمی تھیں اور خود پر نظریں جمائے رکھنے کے لیے انہوں نے عجیب عجیب حلیے اختیار کر رکھے تھے۔ بھوتوں جیسے!
کسی کے بال کالوں کی طرح گوندھے ہوئے اور لمبے تھے تو کسی کا سر چیتل کے لوٹے کی طرح چمک رہا تھا۔ کسی کے کانوں میں بالا تھا کسی کی ناک میں کوکا۔ کسی کے گلے میں مالا تھی تو کسی کی کلائی پر پٹہ۔
رواج کے مطابق ایک دوسرے سے "سبقت" لے جانے کے لیے ان کے یہاں یہی "معیار" باقی رہ گیا تھا، غیر معیاری سا!
اگرچہ میوزک کے ہتھیاروں کے تابڑ توڑ حملوں میں فضا کا سارا سکون غارت کر ڈالا تھا، مگر دوسری طرف بینڈ والے بری طرح اپنے میوزک سمیت لوگوں کے حواس پر چھا چکے تھے اور خواہ مخواہ ہی انہیں جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔
پہلے پہل انہوں نے نام نہاد حب الوطنی کے جذبہ کو، بے وقت اجاگر کرنے کے لیے، کسی قومی دن کے اعزاز میں دی جانے والی تقریب کی طرح، قومی گانوں پر اپنی بے سری آوازیں قربان کیں۔ پھر اچانک ہی فلمی گانوں پر اتر آئے۔ پھر ملکی گانوں نے بارڈر کراس کر لیا۔
پھر فرمائشوں کا دور شروع ہوا۔ پہلے عمر رسیدہ معززین کی "عزت" رکھتے ہوئے پرانے پرانے راگ کھنگالے گئے۔ پھر نئے دور والوں نے اپنا حق جتایا اور "قبضہ" کر لیا۔
پھر کئی نوجوان نئے دور کے ٹھیکیداروں کی طرح میدان میں اتر آئے اور سٹیج کے آگے الٹا سیدھا بھنگڑا پیش کرنے لگے۔ انہیں کسی میدانِ جنگ میں مصروف جہادی سمجھ کر، اطراف میں جمع لڑکیوں نے، جو کرسیوں کے باوجود صرف اس لیے کھڑی تھیں کہ آسانی سے دکھائی دی جا

سکیں۔ خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تالیاں اور سیٹیاں بجا ڈالیں۔ کچھ نے جوش میں خود بھی تھرکنا شروع کر دیا تو بیٹھے ہوؤں کو اکسانا شروع کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہی رقص و سرود کا سماں بندھتا چلا گیا۔

ماحول اتنا دوستانہ ہو گیا کہ رشتوں کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اخلاقی قدروں کو تہذیبی انا کی بوسیدہ دیواریں گراتی چلی گئیں۔

مرد و زن کا فرق یوں مٹ کے رہ گیا جیسے دونوں کو برابر حقوق حاصل ہو گئے ہوں اور ملک آنے والے زمانے میں اڑ کر پہنچ گیا ہو جس کے خواب جوان دلوں میں مچل رہے ہیں۔

''آزاد ملک''!

حدیں پار ہونے والے کب پیچھے مڑ کر دیکھا کرتے ہیں۔ انہیں تو ڈر ہوتا ہے کہ کہیں پتھر کے نہ بن جائیں۔

پھر زمانہ بھی، گردش کی اسی منزل پر کھڑا تھا جہاں لوگوں کو سورج کے ''مغرب'' سے طلوع ہونے کا انتظار تھا! تہذیب و تمدن کا نیا سورج!

کیمرہ مین بھی ایسے ہی وقت کے انتظار میں تھا۔ وہ پوری جانفشانی سے اپنے کام میں جت گیا تھا۔ جاسوسی کی غرض سے آئے ہوئے رپورٹرز، چوکس ہو چکے تھے۔ کچھ ذاتی سیل فونوں نے بھی یہی کام سنبھال لیا تھا۔ البتہ اکا دکا مذہبی رجحان زدہ مخلوق کیمروں اور اپنے آپ سے چھپتی پھر رہی تھی۔

نوکر چاکر ایک دوسرے کے منہ تکتے تھک رہے تھے۔ ''شایان ولا'' کے باہر کھڑے، کشکول سنبھالے ہوئے بھکاری، کبھی اللہ توبہ! اللہ بھلا! چلا رہے تھے۔ بھکاری عورتوں کی گودوں کے بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔

باوردی مجسمے جوں کے توں کھڑے ہوئے تھے۔

آسمان پر چاند بھی آنکھیں مل مل کر سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو وہ بھی بادل اوڑھنا بھول گیا تھا۔ چاندنی نے ماحول کو اور بھی مافوق الفطرت بنا ڈالا تھا۔

☆☆☆

پھر پتہ نہیں کتنی ہی دیر وہ تماشہ یونہی چلتا رہا۔ دھما دھم کا شور نا جانے کب تلک خوابیدہ کائنات

کو جھنجوڑتا رہا۔مگر کسی چرند پرند کی یہ مجال نہ ہو سکی کہ وہ قدرت کا اصول توڑ کر جھانک ہی لیتا۔سب ہی اپنی اپنی حد کے اندر تھے۔شکایت مجبوری کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔

یوں لگ رہا تھا تمام مخلوق اپنی اپنی پناہ گاہ میں دبکی بیٹھی ہو۔جیسے انہیں ڈر ہو کہ کوئی طوفان آنے والا ہے۔جیسے آسمان ٹوٹنے والا ہے۔جیسے تارے گرنے والے ہیں یا شاید چاند ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا ہے۔

نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔یہ بات ہرگز نہیں تھی۔دراصل وہ تو کئی سال پہلے آنے والی قیامت نہ بھلا پائے تھے۔ابھی تک اسی عذاب کا خوف ان پر طاری تھا جو بھیانک خواب کی طرح بار بار جاگتی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔

تاریخ کے ورقوں پر رقم ایک ہولناک زلزلہ!جس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارا علاقہ اوپر تلے کر ڈالا تھا۔جس نے چلتے پھرتے انسانوں کو موت کے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔جس نے ننھے منے بچوں کو ہمیشہ کی نیند والی لوریاں سنا ڈالیں تھیں۔جس نے بوڑھوں کی کمریں اور کاندھے توڑ ڈالے تھے۔جس نے عورت اور مرد کے بیچ کا ہر رشتہ معذور کر ڈالا تھا اور ثابت بچے لوگوں کو زندہ لاشیں بنا کر چھوڑ دیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے،مکان،مساجد،سکول اور بازار ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گئے تھے اور سارا علاقہ ہی تو ایک بڑی قبر کی طرح ہو کر رہ گیا تھا جس پر بچنے والے ماتم کناں تھے۔

ایک ایسا سانحہ جسے کسی نے''قہرالٰہی''جانا تو کسی نے مکافات عمل۔مگر ایسا نہیں کہ کوئی بھی آج تک اسے بھلا نہیں پایا تھا۔

صرف انسان ہی بھول جاتے ہیں!جو حقیقت کی بجائے،آ سیبی دنیا میں جینا اور جیتے رہنا چاہتے ہیں۔

جیسے،دھکتی زمین کے اوپر تیز دھڑکنوں والے ناچے کودتے انسان یہ بھول ہی تو گئے تھے کہ اسی زمین کے نیچے کتنے ہی دلوں کی دھڑکنیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔

شیطان کی نادیدہ انگلیوں پر ناچتے ہوئے پتلیوں جیسے جسم کیونکر محسوس کر پاتے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی قبروں پر دھمال ڈال رہے ہیں۔

نعمتوں کے نشے میں سرشار محو رقص،خود فراموشوں کو ہوش ہی کہاں تھا کہ یہ زمین کون سی ہے۔

جس پر ''شایان ولا'' کی تعمیر ہوئی تھی۔

☆☆☆

آخر کیونکر وہ یہ سانحہ بھول گئے تھے جس نے زندہ لوگوں کو قبر کے خوف میں مبتلا کیا تھا۔ جس نے ڈاکو کی طرح زندگی کی تمام رونقیں چھین لی تھیں۔ جس نے انسانوں کے گلے خشک کر ڈالے تھے۔ جس نے میڈیا کی آواز کو پکار بنا ڈالا تھا۔ جس نے ملک سے دور بسنے والوں کے کلیجے دبوچ لیے تھے اور کیمروں کے آگے ملک کو تماشہ بنا ڈالا تھا۔

آج تقریبیں منعقد کرنے والے کتنے سماجی اور سیاسی ٹھیکیداروں کو یاد تھا کہ انہی مرے ہوؤں کے نام پر وہ آج تک کتنا ہی سرمایہ، چندوں کی شکل میں اپنے خزانوں میں ڈال چکے تھے۔ جیسے خودزمین تلے جائے بغیر ہی آسمان پر پہنچ جائیں گے۔

یاد دلاتا بھی تو کون! مرنے والے نہ خود جاگ سکتے تھے نہ لوگوں کے ضمیر جگا سکتے تھے۔ جو سویا ہو وہی جاگ بھی سکتا ہے، مگر ضمیر تو شاید کب کا مر چکا تھا۔ خودغرض اور بے حس انسانوں کے جسموں میں ''خودکشی کی موت''!

نہیں تو ایک بار ضرور سوچتے کہ قہار خدا آج بھی چاہے تو انہیں اسی سال اور اسی حلیے میں، اسی جگہ، ابھی، بھولنے کا مزہ چکھا سکتا ہے۔

نہ جانے کب سے انسانیت کا بھوت، حیوانیت اور شیطانیت کا لبادہ اوڑھے دندناتا پھر رہا ہے اور پھرتا رہے گا۔ نا جانے کب تک روحانی ترقی کا مشتبہ مستقبل، سہمے ہوئے بچے کی طرح، اپنے ہی والدین کے پیچھے چھپتا رہے گا۔ نا جانے کب مذہب، کلچر کی اوٹ سے باہر نکل کر جلوہ افروز ہو گا! کوئی نہیں جانتا!

کئی سال پہلے سنا تھا کہ اس روز سورج سے خبر پا لینے کے بعد رات کو چاند نہیں نکلا تھا۔ پھر کتنے روز بعد جب چاند نکلا تو اس کی آنکھیں بھی اسی ننھی بچی کی رت جگی آنکھوں کی طرح سرخ تھیں، جو صدمے کے مارے کئی راتیں سو نہ سکی تھی۔

بس اس دن کے بعد ہی چاند، کچھ ڈرپوک سا ہو گیا تھا، بار بار بادلوں کی اوٹ لے کر چھپ جاتا تھا۔

اب بھی اُس میں یہ سب کچھ دیکھنے کی ہمت کہاں تھی!

☆☆☆

نا جانے اور کتنی دیر سٹیج ہلتا رہا۔ زلزلے کے جھٹکوں کی طرح، زمین کی سطح مچلتی رہی اور ڈائیس پر پڑا قرآن کریم کپکپاتا رہا جسے شاید قاری صاحب بوکھلاہٹ میں وہیں بھول گئے تھے۔ پتہ نہیں کسی کو دن کی آخری اذان بھی سنائی دی تھی یا نہیں۔۔۔ البتہ گنتی کے چند لوگ، شایان ولا کی عمارت کے اندر عبادت میں مصروف تھے۔ جہاں رحمت کے فرشتوں نے پہلے سے پناہ لے رکھی تھی۔ بہت سے بھکاری تھک کر اونگھنے لگے تھے، معصوم بچے بلک بلک کر اپنی ماؤں کے آغوشوں کی واحد پناہوں میں تھک کر سو چکے تھے۔ البتہ باوردی مجسمے جوں کے توں کھڑے تھے۔ دن تو ڈھل گیا تھا مگر یادیں باقی تھیں، ایسے ہی کسی دن کی۔

یہ محض اتفاق تھا یا کچھ اور۔۔۔ کہ کئی برس پہلے اسی جگہ، اسی تاریخ پر۔۔۔ کوئی المناک سانحہ رونما ہوا تھا۔

گھپ اندھیرے کے سایوں کی اوٹ سے جھانکتی "شایان ولا" کی دودھیا عمارت کسی سجے سجائے "برتھ ڈے کیک" کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

مگر وہ کیک کسی "سالگرہ" کا نہیں تھا۔۔۔ "برسی" کا کیک تھا۔

کمبل

فزا نے لیونگ روم کے سہ نشتی صوفے پر لیٹے ہوئے دادا جی کو کمبل اوڑھا دیا اور ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مکان کی بالائی منزل پر واقع اپنے چھوٹے سے حجرے نما کمرے میں گھس گئی۔ اس نے دادا جی کا چہرہ دیکھنے سے قصداً اجتناب کیوں کیا تھا۔ یہ بات شاید اسے بھی معلوم نہیں تھی، لیکن یکدم دادا جی کا چہرہ اس کی نظرں کے سامنے آ کھڑا ہوا، جس پر پھیلی ہوئی شکنوں کے جال میں، اداسی اور مایوسی، تہہ در تہہ سمٹی ہوئی تھی۔ دادا جی ـــــــ جو اس لمحے، اپنا کمبل جیسا بڑھاپا اوڑھے صوفے کی پشت کی جانب کروٹ لیے سو رہے تھے۔ کمبل ـــــــ جس کی شکنوں میں اداسی اور مایوسی کی تہیں تھیں۔

چند لمحوں بعد، سیڑھیاں چڑھتے قدموں کی ہلکی آہٹ، رات کے پچھلے پہر کے پراسرار سکوت میں گم ہوگئی تو دادا جی، ملک سعید احمد، نے ہاتھ سے سرکا کر کمبل کا کونا اپنے چہرے پر اوڑھ لیا اور گھٹنے جوڑ کر مزید سمٹ گئے۔ کسی کچھوے کی طرح اپنے ہی اندر چھپنے کی اس کوشش میں پہلے ہی سے اکڑے ہوئے تکیے کے پہلو میں چند آنسو گر کر گم ہو گئے۔

فزا اپنے بیڈ روم کی لائٹ آن کیے بغیر ہی کافی دیر تک ادھر اُدھر کچھ ٹٹولتی رہی۔ پھر ہاتھوں میں کچھ سنبھالتے ہوئے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

سٹریٹ لائٹس کی ہلکی نارنجی روشنی میں دوسری جانب کے ٹاؤن ہاؤزز (Town houses) کی لمبی قطاریں دکھائی دے رہی تھی جیسے ان گنت قبیلا شی لڑکیاں، بانہوں میں بانہیں ڈالے، خاموشی کے سروں پہ محوِ رقص ہوں۔

بیرونی طور پر ایک ہی طرزِ تعمیر لیے ہوئے، بظاہر سر جوڑے کھڑے، ڈال ہاؤزز جیسے تمام گھر، حقیقت میں ہر لحاظ سے مختلف تھے۔ اندرونی طور پر وہ لحاظ قومی تھا یا علاقائی، مذہبی تھا یا

ثقافتی، روایتی تھا یا نسلی، مگر امتیازی ضرور تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گھروں کے باسی، ہمسائے ہو کر بھی ایک دوسرے سے ناواقف ہی تھے۔ آشنا ہو کر بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ یکسانیت کا تاثر جھوٹا تھا۔

اصل ستم تو یہ تھا کہ گھروں کے اندر بھی کئی گھر تھے، ہر شخص اپنے اوپر، اپنا اپنا خول اٹھائے پھر رہا تھا۔ کچھوے کی طرح جب چاہتا سر باہر نکال لیتا، جب چاہتا اپنے ہی اندر گم ہو جاتا۔

☆☆☆

فزا نے ایک ہاتھ میں دبے ہوئے لائیٹر کی مدد سے، دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا سگریٹ سلگا لیا۔ یکدم نیم تاریکی کے چہرے پر سرخ روشنی کا تلک نمودار ہوا اور سوچ کا راستہ دھوئیں کی لکیر کے پیچھے کہیں کھو گیا۔

ہوا رکی ہوئی تھی۔ فضا میں حبس کا عنصر گھلا ہوا تھا۔ کھڑکی کے باہر بھی فزا کا دم گھٹنے لگا تھا مگر وہ اپنے خول میں گھسنے سے گھبرا رہی تھی۔ اس لیے بس یونہی خلاء میں گھورے جا رہی تھی۔ جس میں پھیلے ہوئے خالی پن کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وکی سے، جو عنقریب اس کا فیانسی بننے والا تھا، فون پر بات کر لے مگر آج ہی تو اسے یہ احساس ہوا تھا کہ امریکی لب و لہجے میں پنجابی بولنے والا، وقاص عرف وکی بھی اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ بھی تو اپنے الگ خول میں مقید تھا اور شاید آئندہ پوری زندگی ہی وہ پوری طرح ایک دوسرنے کے خول میں نہ داخل ہو پائیں گے۔

فزا کے ماتھے پہ اداسی اور مایوسی کی شکنیں ابھرتی گئیں اور وہ بھاری قدم اٹھاتی ہوئی بیڈ پر آ گری۔ ایک نظر اس نے سلگتے ہوئے سگریٹ پر ڈالی جو شاید خلاء سے نکل کر اس کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔

دبی دبی آگ اور دھواں اگلتا ہوا ''تمباکو کا رول'' جو اس کی کمزوری تھا نہ ضرورت۔ جسے پینے کا ارادہ کیا تھا نہ کبھی ترک کرنے کا وعدہ مگر کبھی کبھی وہ ضرور کسی خاموش شکایتی رقعے کی طرح اس کی انگلیوں میں آ پھنستا۔

یونہی تجرباتی طور پر آزمانے کے بعد، قصداً تو بس چند ایک بار ہی اس نے اسے پھونکنے کی کوشش کی تھی۔ انتقاماً۔۔۔۔۔ پہلی بار۔۔۔۔۔۔ جب سب سے بڑی بہن شانزہ نے ایک مخلوط

نسل کے۔۔۔۔۔۔لڑکے نما بڈھے سے شادی کا اعلان کیا تھا، جو اسے کالج میں آرٹ پڑھاتا تھا۔ پھر ایک روز وہ دونوں اطلاع دینے کی ضرورت سمجھے بغیر ہی امریکہ نکل گئے۔ ایک دو بار فون آیا پھر نامعلوم عرصے کے لیے رابطہ منقطع ہو گیا۔ معلوم نہیں ان دونوں کا وہ "ہنگامی بندھن" کب تک بندھا رہا ہو گا۔ مگر ایسے بندھنوں کا اعتبار ضرور اٹھ گیا۔

فزا کے ابو جی ملک جاوید احمد جو کئی سالوں سے "ڈیڈ" کہلائے جا رہے تھے، نے اس واقعہ کے بعد ہی تو یہ موقف اپنا لیا تھا کہ۔۔۔۔۔۔اب وہ وطن واپس نہیں جائیں گے۔ اپنی ضدی طبیعت کے باعث وہ اپنی بات پر اس حد تک اڑے رہے کہ اپنی والدہ کی وفات پر بھی بیماری کا جھوٹا بہانہ بنا کر چھوٹ گئے۔ والدہ جو اکلوتے بیٹے کی جدائی میں گھل گھل کر ختم ہو گئی تھیں۔

پھر دوسری بار، شاید اس روز، جب دوسری بڑی بہن حرا نے "مس پاکستان کونٹیسٹ" کی شکست خوردگی مٹانے کے لیے اگلے سال ہی "مس بیکینی کونٹیسٹ" میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا تھا اور پھر اپنی آزادانہ رائے کا حق محفوظ رکھنے کی خاطر وہ اپنی ایک ہم خیال سہیلی کے ہمراہ الگ اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئی تھی۔ اس دن کے بعد سے فزا نے کبھی بہنوں کو بہن سمجھا، نہ کسی لڑکی کو سہیلی۔

پھر شاید اس رات جب امی جی، شائستہ بیگم عرف ممی کی آئے دن کی بے تکی پارٹیوں میں لازمی شمولیت اختیار کرتے رہنے والے علیم انکل نے اُس سے غیر اخلاقی بے تکلفی برتنے کی کوشش کی تھی جو Store کے کسی ریگولر کسٹمر کی قسم کے، "ریگولر گیسٹ" بننے کے خبط میں مبتلا تھے۔ اس روز پہلی بار اسے بھائی کی کمی محسوس ہوئی اور بڈھوں کا احترام اس کے دل سے جاتا رہا تھا۔

وہ سگریٹ نہ اٹھاتی تو کیا 911 کا نمبر گھما کر احتجاج کرتی جو احتجاج کے نام پر تماشہ بنانے کی پالیسی تھی تا کہ دور کے لوگ ان جوتوں میں اتر جائیں جن میں پاس بسنے والے نہیں گھس پاتے۔

بدحواسی میں وہ کھانسنے لگی۔ اس نے اپنے سر کو زور کا جھٹکا دیا اور ادھ جلا سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ نہ جانے کیوں اس لمحے اس کے تصور میں اس گوری عورت کا سراپا ابھر آیا جو بس سٹاپ والے راستے پر ایک روز اس کے آگے آگے چل رہی تھی۔ عورت کی بوسیدہ سکرٹ سے نکلتی ہوئی نحیف ٹانگیں، پرانی طرز کے کوٹ شوز کی کمزور سی ہیل پر ادھر اُدھر ڈول رہی تھیں۔ اس کی ڈولتی چال کی وجہ سے فزا کو کئی بار اپنی سمت بدلنا پڑی ورنہ وہ ضرور اس سے ٹکرا جاتی۔ وجہ صرف اتنی سی تھی کہ وہ فٹ پاتھ پر گرے پڑے ہوئے، ہر ادھورے، مسلے ہوئے سگریٹ کی لمبائی کو

نظروں سے ٹٹولتی جارہی تھی۔ جس کسی کی لمبائی میں مزید سلگائے جانے کی گنجائش موجود ہوتی، وہ بے نیازی سے جھکتی اور اس سگریٹ کے ٹکڑے کو اٹھا کر اپنی پرس نما ٹوکری میں ڈالتی جاتی۔

آنے جانے والے کسی راہ گیر کو گوری عورت کی اس حرکت پر کوئی اعتراض تھا نہ ابہام، مگر فزا تو آج تک یہی جاننے کی کوشش کررہی تھی کیا کسم پرسی کے عالم میں ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ تنکا بھی سہارا لگنے دیتا ہے کہ اگر دکھائی دے جائے تو انسان اسے بھی ہاتھ بڑھا کر چن لیتا ہے۔

فرسٹ ورلڈ میں ایسے مناظر! وہ مسکرادی! اور بستر پر جا گری۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ کمبل کے کونے کے نیچے چہرہ چھپائے گہری نیند سورہی تھی۔

☆☆☆

سہارا؟ شائستہ بیگم کچھ ایسے ہی جھوٹے سہاروں کے سحر میں ڈوبی رہنا چاہتی تھیں۔ جیسے ان کی نام نہاد سہیلیاں، غیر ضروری خریداریاں اور بے تکی پارٹیاں!

کچھ برس قبل جب دیکھا دیکھی وہ بھی وطن پرستی کے جذبے سے سرشار دکھائی دیتی تھیں تو اس پرانے علاقے میں مسز راؤ کے ہاں ہر ویک اینڈ پہ "وطن پارٹی" اٹینڈ کرنے انہی تینوں بچیوں کے ہمراہ بڑے شوق سے جایا کرتی تھیں۔ جس میں وطن کی اچھائی کا کم اور برائی کا موضوع زیادہ "ہاٹ" ہوا کرتا تھا۔ وطن کی کم کم اور کلچر کی باتیں زیادہ زیادہ ہوتیں۔ اکثر اوقات تو بے وجہ ڈھولکی پیٹ پیٹ کر ٹپے بھی گالئے جاتے جس پر پتہ نہیں وہ تینوں لڑکیاں اندر ہی اندر شرمندہ، شرمندہ سی کیوں ہوجایا کرتی تھیں۔۔۔۔۔

آہستہ آہستہ انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ اکثر لوگ صرف آرٹ ہی کو کلچر سمجھتے تھے اور خوامخواہ مغرب میں مشرق اگانے کی کوشش میں تھے۔ حالانکہ یہاں تو وہی کچھ پنپ سکتا تھا جو اس سوسائٹی کا حصہ بن جائے جیسے Yoga۔ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا تو اس کی اصل روایتوں کو اپنائے بغیر ان کا پرچار کرنا محض خام خیالی تھی۔

یہی خواتین جو یہاں سر جوڑے ہوئے تھیں اگر باہر مختلف مقامات پر مختلف حلیوں میں ایک دوسرے کو دکھائی دے جاتیں تو یوں کتراتیں جیسے پہچانا بھی نہ ہو۔ عیدگاہوں سے نکلتے ہوئے، آزادی پریڈ کے دن، اپنوں اور غیروں کی پارٹیوں میں، موقع اور محل کی مناسبت سے حلیے ہی نہیں موڈز بھی بدل جاتے اور ترجیحات بھی تبدیل ہوجاتیں۔

پتہ نہیں ہر کوئی ہر وقت کسی نہ کسی کنفیوژن میں کیوں تھا اور خاموشی کی زبان سے کیوں چلا رہا تھا
''جاؤ! جاؤ! مجھے اکیلا چھوڑ دو'' اور پھر اکیلا ہو جانے کے بعد جھوٹے سہاروں سے دل بہلا رہا تھا۔
جسے جان بوجھ کر خود کو دھوکہ دینے کا خواہاں ہو۔

آپ تو شائستہ بیگم کی تینوں بیٹیاں ''ٹین ایج'' کا دورانیہ عبور کر چکی تھیں۔ مگر بیگم راؤ'' بننے''
کے چکر میں، وہ خود کو بھلا چکی تھیں۔ کوئی ''آنٹی'' کہہ کر پکارتا تو انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے چباتے
چباتے اچانک کڑوا بادام منہ میں آ گیا ہو۔ آنٹی کون؟'' وہ بوکھلاہٹ میں ادھر اُدھر تکنے لگتیں۔
اگر کوئی منچلا Customer، سہ رنگی دھاریوں والے، بے ہنگم چھتے جیسے بالوں سے
ڈھکے چہرے پر، نظر ڈالے بغیر، انہیں Miss کہہ ڈالتا تو وہ اچھل ہی تو پڑتیں۔

یکدم ان کا جی چاہتا کہ سٹور کا سارا سامان مفت ہی اس قدر شناس کسٹمر کی نذر کر دیں۔ ایسے
موقع پر وہیں کہیں موجود ان کے شوہر ملک جاوید احمد غرانے کے انداز میں کھنکھارنے لگتے اور وہ
غائب شدہ سے منیر صاحب، کچھ مزید ہی غائب ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگتے۔

☆☆☆

ملک جاوید تو پرانے سرمایہ دار تھے، جنہیں جدّی پشتی بھی کہا جا سکتا تھا۔ کئی برس پہلے اس ملک
میں ان کی آمد بزنس کیٹاگری (Business Category) میں ہوئی تھی۔ شاید اس لیے
انہیں وہ دھکے کھانے نہیں پڑے تھے جو دوسروں کو کھانے اور ہضم کرنے پڑتے ہیں اور نہ ہی
اپنے Qualification Background کی تختی گلے میں لٹکائے پھرنا پڑا کہ ان کا بیک
گراؤنڈ تو ''سرمایہ'' تھا۔ سرمایہ جو سرمایے کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتا ہے اور شاید عزت کو بھی۔
اسی لیے جلد ہی ان کے دو، اور دو بیگم کے قدموں پر کھڑا ہونے والا Franchised کاروبار چلا
اور پھر یکدم دوڑنے لگا۔ یوں چند ہی سالوں میں دونوں میاں بیوی خود بھی چار پہیوں کی گاڑی بن
چکے تھے۔ جسے صرف اپنی رفتار کی فکر تھی، سواریوں کی سلامتی کی نہیں!

اگرچہ ان کے اطراف میں ایسی کئی گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ پھر بھی بہت سے لوگوں پر انہوں
نے ظاہر تک نہ ہونے دیا تھا کہ وہ پاکستان سے آئے تھے۔ گویا وہ ان انعام یافتہ لوگوں کے
زمرے میں شامل ہو چکے جو بات بات پر کہا اٹھتے ہیں 'چھڈ و جی پاکستان نے ساتوں کی دتا اے۔''
ایک روز ایسی ہی بات پر، وہ ''جمع غائب'' منیر صاحب اچانک ''جمع حاضر'' ہو گئے اور اپنا

ازلی جھکا ہوا سر اٹھا کر بولے۔ ''تو ملک صاحب آپ اتنے عرصے تک وہاں کیا کر رہے تھے؟''

منیر صاحب کی جو قریب قریب ان کے ہم عمر ہی تھے، اس غیر متوقع جرأت پر ملک صاحب نے اپنی غرائی ہوئی نگاہ ڈالی تو منیر صاحب کا نادانستہ طور پر اٹھا ہوا سر پھر سے جھک گیا۔ مگر پہلے سے کچھ زیادہ ہی۔ وہ بیچارے تو پہلے ہی جھکے ہوئے تھے۔ ایک زمانے تک وہ سرمایہ کاری کے لیے استعمال ہونے والا زینہ تھے، جس کی پارٹنر شپ ریکارڈ سے غائب ہوا کرتی ہے۔ مگر اب تو حالات کی ستم ظریفی نے انہیں ایک مجبور ملازم بنا ڈالا تھا۔

ایک زمانے میں منیر صاحب جس گھر کے مالک ہوا کرتے تھے۔ اب اسی گھر کی Basement میں دبکے پڑے تھے اور مالک مکان تھے، جناب ملک جاوید احمد صاحب!

ویسے بھی خود کو نیچا دیکھنا اور دکھانا ان کی Second Nature بن چکا تھا۔ پہلے وہ بیوی اور سسرال والوں کے پیچھے پیچھے رہے جن کے باعث وہ دولہا کے روپ میں Sponser ہو کر آئے تھے۔ پھر آزاد خیال اولاد نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مگر وہ کبھی یہ نہ کہتے کہ کسی نے انہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ یہی کہتے کہ وہ خود ہی سب کو ان کی بہتری کی خاطر چھوڑ آئے تھے اور اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ایسی شکایت نہ تھی جو 911 پر لگائی جا سکتی تھی۔

اب ملک جاوید انہیں ایسے کیسے چھوڑ دیتے۔ جھٹ چڑھ دوڑے۔ ''تو جناب منیر صاحب، آپ ابھی تک کیا کر رہے ہیں یہاں پر، کس نے روکا ہے آپ کو وطن واپسی سے؟'' اور پھر فضا میں ایک غرغراہٹ آمیز قہقہہ بلند ہو گیا۔

سوال کا جواب سوال ہی سے دے کر چڑھائی کر دینا اور پھر قہقہہ لگا کر اپنی یک طرفہ فتح کا جھنڈا گاڑنا، ملک جاوید کی First Nature تھی۔

منیر صاحب تو خجالت کے مارے چپکے ہو رہے اور بلاوجہ ہی ادھر کا سامان ادھر منتقل کرتے رہے مگر شائستہ بیگم سے نہ رہا گیا، جو اس لمحے ایک کسٹمر کی خریداری Scan کر رہی تھیں۔ نہایت غیر شائستہ انداز میں وہیں سے چلا اٹھیں۔

''منیر بھائی! کیا منہ لے کر جائیں گے آپ وہاں! وہاں کے لوگ تو نہ آنے والے کو کبھی معاف کرتے ہیں نہ واپس جانے والوں کو! یہ Cans یہیں رکھ دیں اور ہماری طرف سے ابھی چلے جائیں، کوئی پابندی نہیں ہے۔''

شائستہ بیگم کا اردو لہجہ، ملک جاوید سے بھی گیا گزرا تھا۔ ان کی بات Scanner سے بھی زیادہ تھانیدارانہ! جس نے فوراً ہی منیر صاحب کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

منیر صاحب ایک بار پھر "جمع غائب" ہو گئے اور دروازے کے باہر موجود کسٹمر کی جانب نکل پڑے جو اس لمحے، باہر لگے Special Items کھنگال رہی تھی۔

پھر بھی ملک جاوید غراتے رہے اور مسز شائستہ جاوید کھلکھلاتی رہیں اور انہیں مسکراتا دیکھ کر سامنے کھڑا طویل القامت گورا کسٹمر کبھی اپنی کوچی داڑھی اور کبھی گنجا سر کھجاتا رہا۔

☆☆☆

ملک جاوید اور شائستہ بیگم کی غیر موجودگی کے لیے دورانیوں نے گھر کی اکائی کو منتشر کر ڈالا تھا۔ پہلے پہل، کبھی کبھار ان کی لڑکیاں بھی Customer Service کے فرائض انجام دے دیا کرتیں۔ مگر جب ملک صاحب نے یہ بھانپ لیا کہ کسٹمرز کی دلچسپی خریداری میں کم اور لڑکیوں میں زیادہ تھی تو انہیں آنے سے روک دیا تھا۔ کبھی کبھی فزا خود ہی اپنا I-Pod اٹھائے پہنچ جاتی اور کانوں میں Ear Phone ٹھونسے، ٹائم پاس کرتی رہی۔

ورنہ سٹور میں ایک ملک اور ملکہ رہ گئے تھے۔ جن کی حکومت میں رعایا نہیں تھی۔ بس منیر صاحب کا ایک عدد بھوت تھا جو کبھو کبھی انسانی شکل میں دکھائی دے جاتا تھا۔ ورنہ تو وہ بھی اپنی ذات کی Basement میں غائب ہی رہتے۔

دونوں میاں بیوی ہمیشہ سے ترقی پسند واقع ہوئے تھے جو ادھر اُدھر نہیں آگے ہی آگے دیکھتے رہنے پر یقین رکھتے تھے۔ انہیں فکر تھی تو سامنے آنے والی رکاوٹوں کی، کیونکہ ان کا اصل مشن سفر جاری رکھنا تھا۔ انہیں یہ پرواہ نہیں تھی کہ رکاوٹوں میں کیا کیا اور کون کون تھا۔

اسی لیے تو انہوں نے وطن واپسی کا ارادہ ہی ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنے جوتوں سے وطن کی گرد بھی جھاڑ ڈالی تھی۔ یہاں تک کہ ضروری معاملات میں ہاتھ ڈالنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسی سرد مہری اور بے اعتنائی کے طفیل بالآخر ملک جاوید کے والد جو اپنی زوجہ کی وفات کے بعد، اپنے متنازعہ آبائی مکان میں زندگی کے دن پورے کرنے کے خواہاں تھے، اپنے گھر سے محروم ہو چکے تھے۔

اب مجبور باپ کو یہاں بلانے کا فیصلہ، دونوں میاں بیوی پر وبال بن کر آ پڑا تھا۔ انہیں گھر کا بھیدی گوارہ تھا نہ کوئی تھانیدار۔ انہیں مذہبی یا روایتی بازگشتوں کے بلاووں میں دلچسپی رہی تھی نہ

اپنی Routine میں رد و بدل کی خواہش!

☆☆☆

جس روز سے ملک سعید نے بیٹے کے گھر کی دہلیز پار کی تھی، بہو کا منہ پھول کر ڈبل سائز کا ہو گیا تھا۔ حالانکہ شائستہ بیگم کے بے ضرر سے سسر تو جیسے نیم مردہ حالت میں تھے کہ انہیں اردگرد کا ماحول محسوس بھی ہونے نہیں پایا تھا۔ وہ اپنا خول نما گھر اپنے ساتھ ہی اٹھا لائے تھے جس میں باہر کھلنے والی کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ سب کھڑکیاں اندر ہی کھلتی تھیں۔ ان کے پاس کرنے کے لیے کوئی بات بھی نہ تھی، کوئی سوال تھا نہ جواب!

ہاں ایک احساس ضرور سر اٹھالیا کرتا کہ وہ جو گھر چھوڑ آئے تھے وہ تو ان کے بیٹے کی بچپن اور جوانی کی یادوں سے بھرا پڑا تھا۔ مگر ان کے بیٹے کے گھر میں ان کے بھربھراتے وجود کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

وہ آؤٹ آف فیشن سامان کی طرح کبھی ادھر اور کبھی اُدھر پڑے دکھائی دیتے۔ کوئی مسجد ہی قریب ہوتی تو وہاں جا پڑے رہتے۔ مگر اب مسجد کے قریب گھر لینا ملک جاوید ہی کی ترجیحات میں سے نکل چکا تھا۔ اب وہ کہاں باپ کی خاطر روز روز میلوں دور واقع مسجد کے چکر لگاتے جہاں وہ صرف عید کی نماز کے لیے جایا کرتے تھے۔ اسی لیے یہ کام انہوں نے منیر صاحب کے سپرد کر رکھا تھا جو جمعے کے جمعے، ملک سعید کو کار میں یہ دورہ کروا دیا کرتے تھے اور خود بھی عرصۂ دراز کے بعد، انہیں کم از کم جمعے کے روز مسجد جانے کا موقع مل گیا تھا۔ اگرچہ پورا راستہ دونوں کی خاموشی ہی آپس میں مخاطب رہتی۔

کبھی کبھی دن کے وقت ملک سعید، مضافات میں چہل قدمی کر لیتے، یا قریبی پارک میں کسی بنچ پر جا بیٹھتے اور کبوتروں کو بچی کھچی ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈالتے جاتے۔ کبھی کبھی فزا اپنی اسائنمنٹ کے سلسلے میں لائبریری جاتے ہوئے انہیں اپنے ہمراہ لے جاتی۔

پھر شام ڈھلتے ہی ملک سعید لیونگ روم کے صوفے پر چپک جاتے۔ ان کی وجہ سے خاص طور پر شائستہ بیگم نے لیونگ روم والا ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ کسی کتاب کی ورق گردانی کرتے کرتے ان پر نیند کی آمد ہونے لگتی تو وہ کمبل کا کونہ منہ پر اوڑھ کر یادوں کے آغوش میں سو جاتے۔

کمبل! بلقیس بیگم، زوجہ ملک سعید کے جہیز میں شامل وہ بوسیدہ کمبل جو نشانی کے طور پر وہ

اپنے ساتھ اٹھالائے تھے اور جسے منہ پر اوڑھ کر وہ یادوں کی باسی خوشبوؤں کو سونگھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ وہ کمبل، کمبل نہیں تھا ایک سہارا تھا۔ پرانی روایتوں جیسا پرانا سا کمبل جس میں گرمائی تھی، آسودگی تھی، اپنائیت تھی، تحفظ تھا اور شاید کسی کھوئی ہوئی پہچان کا حوالہ بھی!

کمبل! ایک خول! جس میں کچھوے کی طرح سر گھسا لینے کے بعد وہ اندر ہی اندر کہیں کھو جایا کرتے تھے۔

اول تو شائستہ بیگم کو کمبل میں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی اور دوئم انہیں کمبل سے چڑ تھی۔ اگر کبھی شاذ و نادر انہیں اس کمبل کو ہاتھ لگانا پڑ جاتا تو وہ یوں اٹھاتیں جیسے کسی مردار چوہے کو چمٹی کی مدد سے، دم سے اٹھایا جاتا ہے۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ ابھی تک انہوں نے اس کمبل کو باہر نہیں پھینکا تھا۔ ورنہ ضرور Garbage والے اسے اٹھا کر Recycle کر دیتے اور کمبل کسی Thrift Store میں پہنچ کر کسی New-Comer یا غریب گورے کی راہ دیکھتا رہتا۔ یا پھر کسی بڑی سے "گٹھ" میں مڑا تڑا واپس اپنے ہی وطن پہنچ چکا ہوتا اور اس میں یادوں کی خوشبو کی بجائے لنڈا بازار والی 'Smell' آ رہی ہوتی۔

☆☆☆

کچھ عرصہ سے ملک سعید کمیونٹی سنیٹر بھی جانے لگے تھے۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ انہیں بھیجا جا رہا تھا۔ کمیونٹی سینٹر میں سینئرز کے لیے الگ روم تھا جو Homeless بڈھوں کے لیے تو نہیں تھا مگر وہاں جمع ہونے والے بڈھے ہوم لیس ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ سب شطرنج اور تاش کھیلنے کے لیے ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہتے۔

کمیونٹی سینٹر کا مشورہ شائستہ بیگم ہی کی ایک سہیلی نسیم اختر نے دیا تھا جو خود بھی کمیونٹی ورکر کے طور پر وہیں تعینات تھی۔ نسیم اختر جو عمر میں شائستہ جتنی ہی ہوگی مگر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے انہیں باجی ضرور کہہ جاتی۔ "دیکھیں ناں باجی! یہ لوگ اگر پاکستان میں ہوتے تو کیا ہم ان کو کبھی منہ لگاتے۔"

مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ ایسے ہی لوگوں کو منہ لگائے رکھنا ہی تو نسیم اختر کی جاب تھی۔ طرح طرح کے پاکستانی ہی نہیں، دیگر اقسام کے ایشیائی اور دیسی برادری کے باشندوں کو بازو سے پکڑ پکڑ کر اپنے پروگراموں میں شامل کرواتا اس کے اولین فرائض میں تھا۔ کبھی Apple Picking کے لیے بسوں میں بھرنا، کرسمس اور دیوالی کے فنکشنوں کو کامیاب بنا کر "یکجہتی" کو فروغ دینا اس کے

فرائض کی کامیابی تھی۔ وہ پنجاب سے تھی اس لیے انڈیا اور پاکستان کے پنجاب کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ مگر ملک سعید کو اس عمر میں ایسی تجرباتی ''یکجہتی'' سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو تمام عمر اپنی دونوں آنکھوں سے دو قومی نظریہ ہی دیکھتے آئے تھے۔ یہی وجہ تھی جہاں دو سردار جی اکٹھے چل رہے ہوتے وہ درمیان سے نکل جایا کرتے۔

ویسے بھی ان کے پاس کچھ Share کرنے کو تھا ہی کہاں کہ وہ ''توں توں بج'' والی جاب نما مزدوری کرنے والوں، یا پوتے پوتیوں کی خاطر سکول کے چکر لگانے والوں میں بیٹھ رہتے۔

سال ہونے کو آ رہا تھا مگر انہیں دل کی تسلی کو کوئی ہم وطن نہیں مل سکا تھا۔ اسی لیے دل کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور ایک دن تو انہیں واقعی یوں محسوس ہوا جیسے ان کا دل کسی ملبے تلے دب کر دھڑکنا بھول گیا ہو۔ ہوا یوں کہ ایک جان پہچان والے سردار جی اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ ان کا چہرہ دیکھنے، چند اور ساتھیوں کے ہمراہ ان کے بیٹے کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی ارتھی کا انتم سنسکار کیا جا چکا ہے۔ یعنی ان کی Dead Body کو ایک بڑے Oven میں رکھ کر بھسم کر دیا گیا تھا اور ان کی راکھ Recycle کرنے کے لیے ایک مٹکی میں محفوظ کر دی گئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد انہوں نے کمیونٹی سینٹر کا رخ کبھی نہیں کیا۔ انہیں ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ موت سے قبل ہی Recycle کیے جا رہے ہوں۔

کئی روز گزر جانے کے بعد کمیونٹی سینٹر والے کچھ ساتھی پوچھتے پچھاتے، ملک جاوید کے ہاں آ پہنچے جن کی بدقسمتی سے بیگم شائستہ گھر پر موجود تھیں اور جنہیں نا جانے کیسی آنا پ شناپ سننے کے بعد ملک سعید سے ملے بغیر ہی لوٹا دیا گیا۔

ملک سعید کے کانوں تک صرف یہ بچے کھچے الفاظ ہی پہنچ پائے جو شائستہ بیگم نے دروازہ بند کرنے کے بعد ادا کیے۔ ''پتہ نہیں انہیں سنبھالنے والے کہاں مر گئے ہیں۔ مارے مارے پھر رہے ہیں سب بڈھے!''

شائستہ بیگم کی ٹھیٹھ پنجابی، ملک سعید کے دل پر سے Scanner کی لائٹ کی طرح گزر گئی۔ مگر گزرتے گزرتے سب کچھ چیر گئی۔

آج جیسے شائستہ بیگم نے ازلوں کے بدلے چکا لیے تھے۔ ان کے ادھیڑ عمر چہرے پر فتح مندی کی چمک آ گئی تھی۔ دراصل انہوں نے اسی روز سے ہی ملک سعید کو اپنا دشمن تصور کر لیا تھا۔

جس روز انہوں نے یہ نصیحت کی تھی:

''بیٹا تمہاری تینوں بچیاں، جنت کی کنجیاں ہیں۔ان کی اچھی تربیت کرنا'' اور انہیں یوں لگا تھا جیسے سسر جی نے انہیں بیٹا نہ ہونے کا طعنہ دیا ہو۔

ملک سعید کو یقین ہو گیا کہ کنگال ہو چکے ہیں۔

وہ کچھ نہ بولے۔شکایت کا کوئی حرف ان کے لبوں سے نہ نکلا۔ان کے لیے کوئی شکایتی نمبر نہیں تھا جہاں وہ شکایت کرتے۔

فزا نے یہ سب تماشہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔اتفاقاً اسی روز کتنے ہی روز بعد وکی اس سے ملنے گھر پر آیا تو دادا جی کو ''ہائے اولڈ مین'' کہتا ہوا، سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔وکی جسے ملک سعید خوانخواہ ہی پوتے کی طرح دیکھنے لگے تھے۔

☆☆☆

اگلے روز دن چڑھے تک ملک سعید کمبل تلے دبے رہے تھے۔کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔
فزا نے جاتے ہوئے حسب عادت دودھ کا ایک گلاس اور ڈبل روٹی کے چند سلائس، دادا جی کے قریب والی میز پر چھوڑ دیے تھے۔

دوپہر کسی وقت منیر صاحب کو گھر سے کوئی سامان لینے کے لیے بھیجا گیا تو انہوں نے کمبل کو ہلایا جلایا تھا۔

☆☆☆

اس سے اگلے روز ملک جاوید ڈائیریکٹ فلائیٹ سے وطن روانہ ہو گئے تھے۔ان کے جسم پر پی آئی اے کا ہلکا بھورا سبز کمبل تھا جس میں سے غرغراہٹ جیسے خراٹے ابھر رہے تھے۔ٹھنڈ کے مارے تقریباً سبھی مسافروں نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔نچلی منزل میں کہیں ان کے والد کی میت جوان کی تازہ وصیت کے مطابق ان کے آبائی گاؤں میں سپردخاک کی جانی تھی۔وہ تو یہ سوچتے سوچتے سو چکے تھے کہ انہوں نے کمبل کو چھوڑنے کی بڑی کوشش کی مگر کمبل ہی انہیں چھوڑنے کو تیار نہیں، مگر پاس والی سیٹ پر بیٹھی فزا جاگ رہی تھی۔وہ No Smoking کے سائن کو گھور رہی تھی۔اس کے جسم پر دادا جی والا کمبل تھا۔جسے تھوڑی دیر بعد اس نے چہرے تک کھینچ لیا اور آنکھیں موندلیں۔جہاز خلاء میں اڑتا رہا۔

منزل

کٹتے بھی چلو۔۔۔بڑھتے بھی چلو۔۔۔

ابھی تک کوئی ترانہ گونج رہا تھا۔ترانے کی لے فوجیوں کے بھاری بھرکم جوتوں کی طرح، برس رہی تھی۔زوردار! لگاتار!

دھڑ۔۔۔دھڑ۔۔۔دھڑام

دھڑ۔۔۔دھڑ۔۔۔دھڑام

کٹتے بھی۔۔۔بڑھتے بھی۔۔۔

کٹتے، بڑھتے۔۔۔چلو!

کبھی تیز کبھی آہستہ، مگر جوتے مسلسل میرے سر پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے ہیں۔آہن گر کے ہتھوڑوں کی طرح برستے چلے جا رہے ہیں۔

بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت۔۔۔

دھڑ دھڑ دھڑام۔۔۔!

بازو بھی بہت،۔۔۔سر بھی۔۔۔

بازو،۔۔۔سر،۔۔۔چلو، چلو، چلو

بڑھتے بھی چلو۔۔۔چلتے بھی چلو

چلو، چلو، چلو

دھڑ دھڑ دھڑام

میرے اعصاب کی طنابیں بری طرح کھنچتی ہیں۔میرا سر درد کی شدت سے اکڑ رہا ہے۔اب تو میری سوچ بھی دکھنے لگی ہے۔مگر یہ الفاظ ہیں کہ تھمتے ہی نہیں۔۔۔رکتے ہی نہیں۔۔۔چلتے چلے جا رہے ہیں۔۔۔برستے چلے جا رہے ہیں۔

دھڑ، دھڑ، دھڑام!

بھیڑ میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ میں تیز تیز قدموں سے چل رہا ہوں۔

چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے۔۔۔ منزل، پہ ہی ڈالے جائیں گے۔۔۔

چلتے چلتے میں گر پڑتا ہوں۔۔۔ اوندھے منہ، زمین پر۔۔۔

میرا سر ایک نوکیلے پتھر سے ٹکرایا ہے۔ میرا سر پھٹ چکا ہے۔ خون کا فوارہ میرے سر سے ابل رہا ہے۔ ابلتے ہوئے خون کے ساتھ ساتھ، ساری سوچ اور سارا درد بھی آزاد ہو رہا ہے۔۔۔

دھڑ۔۔۔ دھڑ۔۔۔ دھڑام

"آگے!"

مجھے معلوم نہیں یہ آواز کس کی ہے۔ کمانڈر کون ہے۔ مگر مجھے یہ معلوم ہے فوجیوں کے قدموں کی طرح آگے جانا ہے۔ آگے۔۔۔ بہت آگے! یہ پتھر جس سے ابھی ابھی میرا سر پھٹا ہے، کوئی سنگ میل نہیں ہے۔ میں ابھی ابھی یہ بات اپنے خون سے اس پتھر پر لکھ ڈالی ہے۔ وہ میرے پیچھے آنے والوں کے لیے ہے۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے تو آگے بڑھ جانا ہے۔۔۔ "آگے!"

میں جانتا ہوں شاید یہ نشان دیکھ کر بہت سے واپس مڑ جائیں گے، لیکن کچھ۔۔۔ کچھ تو آگے بڑھیں گے۔۔۔ منزل تو آگے ہے ناں! پیچھے تو نہیں۔۔۔! اور ڈیرے۔۔۔ ڈیرے تو منزل ہی پر ڈالے، جائیں گے رستے میں نہیں!

"بھیا!۔۔۔ بھیا! رکنا نہیں۔۔۔ میرے اچھے بھیا! جلد کرو۔۔۔!" یہ تو چھوٹی کی آواز ہے۔۔۔!!

☆☆☆

"بھیا! رکنا نہیں۔۔۔ چلو چلو۔۔۔ جلدی کرو نا!"

چھوٹی نے مجھے پکارا ہے۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی، بلکہ دوڑنے لگی تھی، حسب معمول۔۔۔ میں تھک کر کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا تو وہ چلانے لگی۔ "چلو۔۔۔ چلو بھیا۔۔۔"

چھوٹی، میری بہن، اسے تو سدا سے آگے چلنے کا شوق تھا۔ میں چاہتا تھا وہ میرے پیچھے پیچھے چلے، بس یونہی! ڈر سا لگتا تھا۔

میں جان بوجھ کر اسے چھوٹی کہا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ بڑی بڑی باتیں بنایا کرتی تھی۔ عجیب

عجیب سوال پوچھا کرتی تھی اور میں اسے ٹوک دیا کرتا تھا۔ "تو جتنی ہے اتنی ہی بات کیا کر!"
کبھی کبھی، اس کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر وہ کوئی نہ کوئی سوال کر ڈالتی۔
"بھیا! یہ کنوئیں کا پانی کون سے سمندر میں ملتا ہے؟"
"کنوئیں کا پانی کسی سمندر میں نہیں ملتا۔ یہیں رہتا ہے۔"
میں جواب دیتا۔ "کیوں، تو کیا کنوئیں کا پانی کبھی آزاد نہیں ہوتا۔"
میں ناراضگی میں کنوئیں میں جھانکنے لگتا۔
کبھی ہم قریب ہی ٹیلے پر جا کر بیٹھتے جہاں آس پاس کے درختوں میں بسے پرندوں کی چہچہاہٹ سن کر وہ پوچھتی۔ "بھیا! پرندے اور جانور بھی آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں؟"
کیا کبھی کبھی یہ ہم سے بھی کچھ کہہ دیتے ہیں۔ کوئی راز کی بات؟"
"کیا یہ بولی جنت کی بولی ہے؟"
"بھیا! کیا جنت میں بھائی بہن نہیں ہوتے؟"
"کیوں میرا سر کھا رہی ہے چھوٹی؟"
"تجھے باتیں بنانے کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے۔" میں چڑ کر جان چھڑا لیتا۔
"کیوں بھیا! میری بڑی بڑی باتیں، تمہارے سر پر سے گزر جاتی ہیں کیا؟" سر پر پگڑی کیوں نہیں پہنتے۔۔۔ابا جیسی؟" "اچھا! قائداعظم والی ٹوپی ہی پہن لیا کرو۔۔۔پھر۔۔۔وہ مجھے چھیڑ کر خود دور بھاگ جاتی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اڑ رہی ہو۔"
میں تو بڑا تھا مگر میرے پاس چھوٹی کے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ پتہ نہیں اسے گاؤں کی دوسری "کڑیوں بالیوں" کی طرح گڑیا کے پٹولے جمع کرنے اور اس کی شادی رچانے کا شوق کیوں نہیں تھا۔ وہ کیوں ستاروں کے آگے والے جہان میں بستی تھی۔
"وہ دیکھو نہ بھیا! وہاں دور۔۔۔وہاں سکول بن رہا ہے۔ ابا سے کہہ کر مجھے بھی سکول میں بھرتی کروا دینا بھیا!"
مجھے لگا وہ فوج میں بھرتی ہونے والی ہے۔ "اچھا!" میں بے یقینی میں بڑبڑایا۔ ویسے چھوٹی کی یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔
ابا نے مجھے سکول میں داخلہ اس لیے دلوا دیا تھا کیونکہ میں لڑکا تھا۔ ورنہ لڑکیوں کو گاؤں سے

باہر بھیجنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ویسے بھی ابا کے خیال میں "پڑھائی" کسی مسئلے کا حل نہ تھی۔ابا نے بچپن ہی میں، مجھ سے دونوں بڑی بہنوں آمنہ اور عائشہ کے رشتے طے کر رکھے تھے۔پھر جھٹ پٹ، دونوں کو اپنے اپنے گھروں کا کر دیا۔میں کوئی دس، گیارہ برس کا تھا جب چھوٹی پیدا ہوئی۔میں نے اس کا نام فاطمہ رکھ دیا۔وہ پنوڑے میں لپٹی کوئی گڑیا دکھائی دیتی۔مگر جب اس نے پٹر پٹر بولنا شروع کیا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی چھوٹے قد کی لیڈر ہو۔میری دلی تمنا تھی کہ کم از کم وہ سکول میں پڑھے۔

ابا تھوڑا "کنبا" تھا! اتنی زمین، جائیداد والا! مگر کتنا کنگال تھا وہ۔تعلیم کا ذکر ہوتے ہی اسے بلاوجہ کی کھانسی لاحق ہو جاتی اور وہ تقریباً کچھ دیر حقے سے منہ ہٹا کر بس ایک ہی بات کھنکھارنے لگتا۔

"او پتر۔۔۔اس ملک میں، ان پڑھ اور پڑھے لکھے میں کوئی فرق نہیں ہے۔کھوں کھوں۔۔۔او پتر دونوں ہی جہالت کے مارے ہوئے ہیں۔"

" کیسے ابا!" میں بھی بحث کے موڈ میں آ جاتا۔آخر میں بھی "مڈل پاس" ہو گیا تھا اور ابا کی ضد کا مقابلہ کرنے کا کچھ حوصلہ مجھ میں بھی آ گیا تھا۔اپنی کلاس میں "مانیٹر" تھا۔ابا پر بھی رعب جما ڈالا۔"

ابا لڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔"او پتر علم سے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا آتی ہے ناں۔۔۔کہ نہیں! اچھے برے کا فرق پتہ چل جاتا ہے۔تو پھر جب پڑھے لکھے بھی صحیح کام نہ کریں تو وہ بھی جاہل ہی ہوئے ناں پتر!" ابا کی بات میں حقے کے دھوئیں کے مرغولوں جیسے لچھے تھے۔

"صحیح!" میرے تصور میں اس آسان سے لفظ کی مشکل مشکل تصویریں بننے لگیں۔

"بیٹا! وہ لوگ گزر گئے جنھوں نے علم سر پر اٹھا رکھا تھا اور کاندھوں پر ذمہ داری" میرے ذہن میں کبھی ابا کی پگڑی تو کبھی قائد کی ٹوپی ابھری۔

"اگر آج بھی ویسے ہی لوگ ہوتے تو ملک کا یہ حال نہ ہوتا!" ابا کا یہ روپ میری سمجھ سے باہر تھا۔"آج کل کا انسان اس طرح کا ذمہ دار کہاں۔وہ تو بس، ٹھیکے دار ہے۔۔۔زردار ہے۔۔۔زمیندار ہے۔۔۔!" اور "زن دار" میں ایک لمحہ کے لیے پریشان ہو گیا۔میرے سامنے اپنی اماں اور بہنوں کے ساتھ گاؤں کی تمام عورتوں اور کڑیوں بالیوں کی بس ماندگی ناچنے لگی۔جنھیں محض "ملکیت" خیال کرتے ہوئے ان کی قسمتوں کے فیصلے کر دیئے جاتے تھے۔جن کا نصیب شاید ایک "کھونٹا" تھا۔ورنہ شاید وہ بھی ستاروں کے آگے والے جہان میں جا بستیں۔

آخر ابا خود ہی مان گیا اور میرے میٹرک میں داخلے سے قبل ہی فاطمہ سکول جانے لگی۔

میں میٹرک کا امتحان دے کر تھک گیا تھا۔ کتابوں کا بوجھ سر سے اترا مگر کندھے بوجھل لگنے لگے تھے۔ ذرا ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابا کی کمزور "پگ" دونوں چاچاؤں کے غضب کے گرد باد میں گھر کر ڈھلکنے کو تھی۔ زمین، جائیداد کے آئے دن کے جھگڑوں کی وجہ سے میں نے طے کر لیا کہ میں وکیل بن کر ابا کو سہارا دوں گا۔

"بھیا! زمین کے ٹکڑوں کا مالک کون ہے انسان یا خدا؟"

ایک روز، گرمیوں کی چھٹیوں میں شام کو ٹیلے پر بیٹھے بیٹھے، چھوٹی کو کوئی بڑی بات سوجھی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی۔

"انسان زمین کا مالک ہو سکتا ہے مگر عزت کا نہیں۔" میں بھی اس خلا میں گھورنے لگا، جس میں چھوٹی ستارے ڈھونڈا کرتی تھی۔ اس لمحہ اس کا ستاروں بھرا آنچل کاندھوں پر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کا چاند سا چہرہ کسی نورانی چمک سے تمتما رہا تھا۔ میں وہ چہرہ کبھی بھلا نہیں پایا۔ جس پر چاندنی کا تاج سجا تھا۔

"بس اس لیے میں نے سوچا ہے میں وکیل بنوں گا۔"

"وکیل! وکیل کیا کرتے ہیں بھیا!"

"وکیل لوگوں کو انصاف دلاتے ہیں۔"

"انصاف کیا ہوتا ہے۔"

"یہی، کہ جس کا حق ہے اُسے حاصل ہو جائے۔"

"جیسے زمین، جائیداد۔۔۔"

"جیسے عزت!" وہ اچھل کر بولی۔

"ہونہہ۔۔۔" میں زمین کو گھورنے لگا۔ جہاں کوئی ٹمٹماتا ستارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

بڑے شہر میں پڑھتے پڑھتے ایک روز میری بے یقینی مجھ پر حاوی ہونے لگی۔ میں اس نتیجہ پر کچھ دیر میں پہنچا تھا کہ بالآخر سبھی اسی System کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں جسے وہ بدلنا چاہتے ہیں۔

"میں Oxford میں پڑھوں گا ابا!"

گویا میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔۔ ابا کی پگڑی چارپائی کی پائینتی پر دھری تھی وہ اپنا حقہ چھوڑ، ٹانگیں پسار کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے گردن کو سہارا دیا اور آنکھیں موندھ

لیں۔اس میں بحث کی طاقت نہ تھی۔

''اچھا پتر۔۔۔کوئی خاص وجہ۔۔۔'' کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں مونڈے مونڈے ہی بات بڑھائی۔

''ابا!اس یونیورسٹی میں قائد نے وکالت پڑھی تھی۔''

دور، بظاہر کسی کتاب کے ''ورقے'' ٹٹولتی فاطمہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ابا کی تھکی ہوئی آنکھوں میں ستارے چمکے، پھر وہ ستارے پانی کے ساتھ بہہ گئے۔وہ اور بھی اداس ہو گیا۔کچھ یاد آنے پر اس نے اپنے پیر، پگڑی سے ذرا دور کر لیے۔میں نے پگڑی اٹھا کر ابا کے سرہانے رکھ دی اور بوجھل دل سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں جانتا تھا ابا کا دم خم بس اس کی انا تھی۔ورنہ وہ بھائیوں کے گٹھ جوڑ میں بہت اکیلا پڑ چکا تھا۔وہ اس انتظار میں تھا کہ میں اپنے بازوؤں سے اس کی پگڑی اُٹھا کر اس کے جھکے ہوئے سر پر سجا دوں۔

☆☆☆

میں اپنا مشن کاندھوں پر اٹھائے پردیس پہنچ گیا۔

وہاں میرے شب و روز اسی دھن میں کٹنے لگے۔میں جب بھی آئینہ دیکھتا اپنا عہد دہراتا۔ایک سپاہی کا عہد۔۔۔جو غلط اقدار اور ناقص نظام کے ''خلاف'' جنگ میں پہلے شہید اور بعد میں غازی بننے کی آرزو دل میں بسائے، لڑتا اور بس لڑتا چلے جاتا ہے۔

کبھی تھک جاتا تو دریا کے کنارے بیٹھ کر، اس کی لہروں کی روانی میں اپنے قدم ناپتا، اس کی گہرائی میں اپنا ارادہ جانچتا۔

کبھی کسی تنہا درخت کے خاموش سائے تلے یکسوئی کا گیان پختہ کرتا۔

سچ کی تلاش اور جھوٹ کے تیاگ کی اس ''پریکشا'' میں کبھی کبھی چھوٹی کی باتوں کی کنکریوں سے میرا دھیان ٹوٹ جاتا۔

''بھیا!گوری میم نہ لے کر آنا۔اپنی مٹی کا رنگ نہ بھول جانا!'' وہ فون پر چھیڑتی۔

''ارے پگلی ایسا گورا گورا رنگ تو وہاں نہیں ملتا'' میں جان کر چڑانے لگتا۔

''گورا کہ پھیکا؟'' وہ بھی کچھ کم نہ تھی۔

''ایسے موہے رنگ کا کیا کرنا، جس میں اپنی خوشبو نہ ہو۔'' وہ اداس ہو جاتی۔

"ارے سن! مجھے شادی وادی نہیں کرنی۔ ویسے بھی پہلے ہماری چھوٹی کی شادی ہوگی۔"

"مجھے بھی شادی وادی نہیں کرنی۔ ساری پڑھائی کنوئیں میں گر جائے گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

ہا۔ ہا میں بھی ہنس پڑتا۔ اس لیے نہیں کہ چھوٹی کی یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ہمیشہ کی طرح میرے سر پر سے گزر کر کہیں اور جا پہنچی تھی۔

اچھا فلسفہ تھا چھوٹی کا مگر کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پڑھائی اور شادی۔ کیریئر کی فکر سے زیادہ ضروری نہیں۔ بنتے بنتے بن جائے گا، ساتھ ساتھ۔ مغرب میں جو لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے بلکہ قائم ہو جانے کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ ان کے گھر بسانے میں دیر سویر ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں، گھر کے مسائل سے کوئی چھوٹے تو ملک کی فکر بھی کرے۔

☆☆☆

آخر ایک روز جب مسائل کا حل ڈھونڈ کر وطن پہنچا تو حالات میرے بس سے باہر ہو چکے تھے۔

مجھے خوش آمدید کہنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیسے۔۔۔ کھیتوں میں لگی دشمنی کی آگ نے فاطمہ کا ستاروں بھرا آنچل روند ڈالا تھا۔ اس کی پراسرار طور پر جلی ہوئی لاش، ٹیلے کے پاس والے کنوئیں سے نکالی گئی تھی۔ صدمے نے ماں کو کفن پہنا ڈالا اور ابا کی سمجھ بوجھ چھین لی تھی۔ اسے پگڑی پہننے کا ہوش ہی نہ تھا۔

چند ہی ہفتوں میں یہ کیا ہو گیا تھا۔ میں سٹپٹا گیا۔ مجھے خبر تک نہ ہونے دی گئی۔ کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ لاقانونیت کے داؤ پیچ نے سبھی کو خاموش تماشائی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی ثبوت تھا نہ گواہ، میں کرتا بھی کیا کرتا۔ کسے پکڑتا، کسے بچاتا، کافی عرصہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلاتے رہنے کے بعد میں نے تمام تر کوششیں ترک کر دیں۔ میری ساری توجہ ابا کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو جی رہا تھا نہ مر رہا تھا۔ پھر ایک روز وہ جنگ بھی ہار گیا اور خالی سر اور خالی ہاتھ لے کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں زیادہ عرصہ خود کو Adjust نہ کر پایا اور دیس چھوڑ کر پھر پردیس جا پہنچا۔

جلد ہی مجھے اچھی ملازمت مل گئی اور میں اپنی زخمی روح پر کالا کوٹ چڑھائے معروف ہو گیا۔ روٹین کی سختی نے مجھے روبوٹ بنا دیا۔ کب دن نکلتا، کب ڈھل جاتا مجھے احساس بھی نہ ہوتا۔ کھڑکی کے باہر جیسا بھی ہوتا میرے ذہن کا موسم ایک جیسا ہی رہتا۔

Law پریکٹس کی خشک ترین آب و ہوا میں ہلکی پھوار بن کر برسیں تو وہ تمہیں ڈیزی کی کچھ

باتیں، جنہوں نے آخر ایک روز میرے دل و دماغ پر چھائی بے یقینی کو دھو ڈالا۔

ڈیزی میری کلاس فیلو ہوا کرتی تھی۔ ایک روز کسی Client کے توسط سے میری ملاقات ڈیزی سے ہوئی۔ بنیادی طور میں عورتوں سے ایک فاصلہ رکھنے کا قائل تھا اور اصولی طور پر میری زندگی میں اب کسی عورت کے لیے جگہ نہیں تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی بات چیت ہوتی رہتی۔۔۔ یونہی پھیکی پھیکی۔۔۔ بن باس!

بات چیت کے تسلسل کی وجہ میرا اور اس کا مشترکہ سیاسی زاویہ نظر تھا۔ برصغیر پر مغلیہ حکومت سے لے کر برٹش راج کے بارے میں اس کی رائے حقیقت پر مبنی تھی۔ اس کے مطابق کسی کی Mother Land پر قبضہ سرے سے ناجائز تھا۔ اپنی مادرِ زمین کو آزاد دیکھنا، ہر حب الوطن کا بنیادی حق ہے۔ کسی بھی جنگ کی فتح کی بنیاد صرف اور صرف اصول ہوتے ہیں بشرطیکہ ان کا شعور حاصل ہو اور اصولوں کو طے کرنے والی اصل وجہ صرف مقاصد ہوتے ہیں۔ اصولوں اور مقاصد کی جنگ میں کبھی ہار نہیں ہو سکتی۔ برصغیر کی آزادی اور پاکستان کے حصول، دونوں ہی واقعات، بااصول راہنماؤں اور باشعور عوام کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

میں اس کی عزت کرنے لگا تھا۔ انسان عزت کما سکتا ہے جب وہ دوسرے پر برتری ثابت کرنے کی بجائے اس کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔

''جیسے کہ عورت کا وجود!'' اس نے شاید برسبیل تذکرہ کہا مگر مجھے بہت کچھ یاد آ گیا۔

''ہر جنگ میں عورت کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔'' میری آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بھی دکھ سے مسکرا دی۔

''اگر سمجھا جائے تو عورت مرد کا دست و بازو نہیں، دماغ بھی بن سکتی ہے۔''

دماغ! مجھے کوئی چمکتا ستارہ یاد آ گیا۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ تبھی ایک ستارہ سا ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔

''مگر رکو! اس کے لیے یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ عورت کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔'' میں نے اسے پہلی بار ٹوک دیا۔

''اور یہ جاننا بھی کہ اسے اس قابل بھی چھوڑا جا رہا ہے کہ وہ ساتھ دے سکے! مشرق کی عورت تمہاری طرح Lucky نہیں ہے ڈیزی!''

''کم آن'' فکر (اس نے میرا نام فخر لینے کی کوشش کی) ظاہریت سے متاثر ہونا درست نہیں۔

مغرب نے بھی عورت کو حقوق دینے میں کافی دیر لگادی۔

آج بھی اندر ہی اندر عورت کی انا کو کچلا جا رہا ہے۔شاید اسے بچانے کے ردعمل میں ہی وہ اپنے جسم کا سہارا لیتی ہے، دماغ کا نہیں۔تم نہیں سمجھو گے۔۔۔ورنہ روز بروز Single Mothers کی تعداد میں اضافہ نہ ہوتا!وہ سنجیدہ تھی۔

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ویسے ہمارے معاشرے میں آج بھی لڑکی کی پیدائش پر ناگواری کا اظہار، عام سی بات ہے۔یہ بات بھی زندہ درگور کر دیئے جانے کی ابتداء کرنے جیسا تاثر ہے۔ لیکن ہاں پھر بھی ہم لوگ مغربی معاشرے کے مقابلے میں، عورت کو زیادہ احترام دیتے ہیں۔''
میں اچانک یک طرفہ ہو گیا۔

''ہوں۔۔۔No-Offence, You Mean Over-Protection! مگر کیا تمہارے ہاں ماں اور بہن کی گالی نہیں دی جاتی؟''میں دم بخود ہو گیا!

''Now!''وہ Point پر آنے لگی۔میں اس کی کہانی سے نا آشنا تھا مگر وہ میری کہانی سے بخوبی واقف تھی۔

''تم اچھے انسان ہو فکر!اپنوں کے لیے اپنے ہی لڑتے ہیں کوئی باہر کا آدمی نہیں۔''

"Go Home!　　Go Make a Difference!"

اس لمحے میں نے جان لیا کہ عورت میں باس، اس کے رنگ اور روپ سے نہیں اس کی سچائی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے جانے کے کتنی دیر بعد تک میں اس باس کے حصار میں مقید رہا۔دیکھتے ہی دیکھتے اس حصار نے پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کیا واقعی پوری کائنات ایک نازک ڈور سے بندھی ہے۔کیا اس لامتناہی جسم میں صرف ایک روح ہے، جو ہر تخلیق، ہر مقصد اور جستجو میں حلول کر جاتی ہے اور اسے اپنی منزل کی طرف گامزن رکھتی ہے۔کیا واقعی کائنات کی سب طاقتیں مل کر منزلوں تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہو جاتی ہیں۔ندیوں، پہاڑوں، چرند پرند بھی کی ایک ہی بولی ہے۔جنت کی بولی!

کیا واقعی ان راستوں پر Good اور Bad Omen, جیسے سنگ میل نصب ہیں؟

کیا واقعی کیمیا گر اپنی کیمیا گری کے ذریعے، گاہے بگاہے جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے۔یا ہم بھی

ہر دور کے انسان کی طرح Delusions کا شکار ہیں۔ راستوں کو منزلیں اور منزلوں کو راستے سمجھنے کی کج فہمی میں مبتلا ہیں؟ کیا آج بھی ہماری سوچ Matter اور Material کے حصار میں مقید نہیں ہے؟ کیا آج بھی ہماری روح، صحیح اور غلط کے فرق سے ناآشنا نہیں؟ کیا سرابوں کی امید میں ہم اپنی تشنگی بڑھا نہیں رہے۔ کیا منزل آنے پر بھی ہم پیاسے نہیں رہ جاتے۔

آخر منزل ہے کہاں، حصار کے اندر یا حصار سے باہر!

☆☆☆

''باہر کا آدمی'' کیا میں باہر کا آدمی تھا۔ جو اپنوں کو ان کے حال پر چھوڑ آیا تھا۔ کیا وطن میں میری ماں کے علاوہ کسی کی ماں نہیں تھی، کوئی اور بہن نہیں تھی۔

میں لوٹ آیا۔

میں نے پریکٹس شروع کی۔ ہر طرف لوگوں کی بھیڑ تھی۔ پڑھے لکھے، ان پڑھ! ''اس ملک میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ برابر ہیں۔۔۔ ورنہ اس ملک کا یہ حال نہ ہوتا'' ہر روز کسی نہ کسی بہانے مجھے ابا کی یہ بات یاد آجاتی۔

ابا اپنے والدین کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے حالات کا ذکر کچھ ایسے انداز میں بیان کیا کرتا تھا جیسے سب کچھ اس کی اپنی آنکھوں کا دیکھا ہوا تھا۔ کیا مشن تھا! جس نے ہر طبقہ، ہر عمر، ہر قوم کو یک جان و یک قالب بنا دیا تھا۔ کیا لگن تھی؟ حصولِ وطن کی!

خدا تھا، دینِ خدا کی ایمانی طاقت اور مخلص قائدین جنھوں نے آزادی کے جھنڈے اپنے سینوں پہ گاڑ رکھے تھے اور انہیں بلند رکھنے کے لیے وہ اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ عورت مرد کے شانہ بشانہ تھی اور قائد کے الفاظ کی تصویر بامجسم بن کر سامنے کھڑی تھی۔ اس کی طاقت، تلوار اور قلم سے بھی زیادہ تھی۔

شاید اس وقت بھی پڑھے لکھے اور ان پڑھ برابر تھے۔ مگر شعور اور ایمان کے لحاظ سے، جہالت اور بے ایمانی میں نہیں۔

میں یہ بات کیونکر ثابت کر پاتا؟ قصوروار ٹھہراتا بھی تو کیسے؟ کس کس کو؟ ہم سبھی تو قصوروار تھے۔ ہم سبھی کی آنکھوں پر خود غرضی اور بے اصولی کی ایسی پٹی بندھی تھی جس نے ہمیں اندھا اور بے حس بنا دیا تھا۔ اپنے فرائض بھول کر ہم دوسرے کے حقوق پر نقب زنی کر رہے تھے۔

منافقت کو سیاست یا مصلحت کہہ کر پکار رہے تھے۔

ہم جو تاریخ کی کتابوں کو Passing Marks کے لیے رٹتے تھے، آزادی کا مطلب کیونکر جان پاتے! ہمیں یہ روٹی، پکی پکائی نصیب ہوگئی اور ہم اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ "ہمارا حق زیادہ ہے"۔ کسی اور کا نہیں۔ مرد برتر ہے، عورت کمتر ہے۔ وہ ضرورت پڑنے پر گدھے کی طرح جوتنے یا دل بہلانے کے کام آنے والا سرمایہ ہے یا پھر غیرت کے نام پر دی جانے والی گالی!

☆☆☆

میں اس بے ضمیری کے خلاف جنگ میں ایک مجاہد کی طرح کود گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی دیر نہیں ہوئی۔ شاید کچھ اور ساتھی مل جائیں جو میری طرح سوچ رہے ہوں اور پھر مجھے ساتھی بھی مل گئے۔ جو بظاہر بے نیاز تھے مگر خوابیدہ نہیں تھے۔ جاگ رہے تھے! خود کو کمزور پا کر خاموش تھے۔ مگر ان کی زبان خمیدہ نہیں تھی جو پہلے قطرے کی طرح ڈر رہے تھے۔ مگر یہ بھول گئے تھے کہ سیپ کا موتی بننے کے لیے ایک ہی قطرہ درکار ہوتا ہے اگر بردبار ہو تو!

ہم نے مل کر ایک Organization بنائی جس میں بہت سے نوجوان مرد اور خواتین کے علاوہ، عمر رسیدہ اور تجربہ کار وکلاء مل کر Volunteer کرتے۔ ہم نے اس تنظیم کا نام Solidarity رکھا۔ ہم نے اپنے ذمے ایسے مقدمات ڈال لیے تھے جن کا تعلق کمزور معاشی طبقے سے تھا۔ ہماری Fundraising سے مظلوم عورتوں، ان پڑھ، بچوں اور بے روزگار نوجوانوں کی مدد کی جانے لگی۔ اگرچہ ہمیں کئی انتظامی اور سیاسی حلقوں سے مزاحمت کا سامنا ہوا مگر ہماری گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ ہمارا نعرہ میدان میں اتر آیا۔ Social Justice کا نعرہ۔ ہم Lincoln کی طرح قانون کے ذریعے خدمت کرتے رہے۔

Nothing Above the Law, Noting Below the Law!

ہمیں آس تھی کہ ہم بدلے تو ماحول بھی بدل دیں گے۔

ہر یوم آزادی کے موقع پر ہم اپنی خصوصی میٹنگ کے دوران تجدید عہد کرتے کہ ہمیں اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک آگے بڑھنا ہے اور اس پرچم کا سر بلند رکھنا ہے، جسے کتر کتر کر جھنڈیاں بنا کر پہلے گلی کوچوں کو سجایا جاتا ہے اور بعد میں قدموں تلے روندے جانے اور نالیوں میں بہہ جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہمیں ماں کے آنچل کو پامال ہونے سے بچانا ہے جو اعلیٰ اقدار کی طرح پامال ہو رہا ہے۔

ہمارے Volunteers تقریب کے بعد پرچم لپیٹے اور جھنڈیاں اکٹھی کرتے تو بہت سے بچے بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہم وطن کو خودکشی کی موت سے بچالیں گے۔

☆☆☆

آج 14 اگست کا دن تھا۔ اسی سلسلے میں منعقد ایک جلسے میں ابھی قائداعظم کے فرمودات پر مبنی ایک تقریر کی گئی ہے۔ کچھ پُرجوش اور پُرامید قومی ترانے بھی بجائے گئے ہیں۔ اے وطن پیارے وطن۔۔۔ ہم دیکھیں گے۔۔۔ چلتے بھی چلو۔۔۔!!!

میدان میں جمع لوگ ساتھ ساتھ ترانوں کے بول گنگنا رہے ہیں اچانک مجمعے میں کسی Terrorist کی موجودگی کی افواہ اڑنے لگی ہے۔ بھیڑ میں اچانک بھگدڑ مچ گئی ہے۔ سب ایک دوسرے کو دھکیل رہے ہیں۔ سب کو اپنی اپنی پڑگئی ہے وہ نفسانفسی۔۔۔ ائیں۔۔۔ ئیں۔۔۔

مجھے بھی کچھ سجھائی نہیں دے رہا، میرے سر سے خون ابل رہا ہے۔ جو ابھی پتھر لگنے سے جاری ہوا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے کا منظر دھندلانے لگا ہے۔ ذرا دور ایک نوجوان عورت دکھائی دے رہی ہے۔۔۔ عورت! یہ تو وہی عورت ہے جو چند روز قبل میرے آفس میں آئی تھی۔ مجھے یاد آ جاتا ہے۔ ہاں وہی ہے جس نے ایک عجیب راز فاش کر کے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ ایک سنگدل گروہ جو کسی نام نہاد فلاحی ادارے کے پردہ میں مایوس نوجوانوں کو خودکش حملہ آور بنانے کے عوض، ان کے پس ماندگان کو خطیر رقم نوازنے کا جھانسہ دے کر ملک میں بدامنی کا کاروبار کر رہا ہے۔ مگر وہ تو اپنے ہی بھائی کے بارے میں بتانے والی تھی جو چند ماہ قبل ہی اس گینگ کی سازش کا شکار ہو گیا تھا اور وہ خود جو ایک صحافی بن کر سچ کہنے اور سچ لکھنے کا عہد کر چکی تھی۔ کیا ہوا اسے۔۔۔ وہ جلدی میں تھی۔ بات ادھوری چھوڑ کر کہاں چلی گئی۔ آخری مرتبہ اس کے موبائل فون پر کوئی Text Message آیا تھا شاید۔۔۔ اور پھر۔۔۔

اور پھر وہ پھٹ گئی۔۔۔!!

ایک دھماکے کے ساتھ۔ اس کا سر فضا میں بلند ہوا ہے۔ فضا میں بارود اور خاک و خون کا غبار چھا گیا ہے۔ ہر طرف انسانی اعضاء بکھرنے لگے ہیں۔

☆☆☆

میں پھر سے زمین پر گر پڑا ہوں۔ میرا بازو الگ ہو کر دور جا پڑا ہے۔۔۔ عورت کے سر کے

قریب۔۔۔!

بازو بھی بہت ہیں۔۔۔سر بھی۔۔۔بہت۔۔۔بازو۔۔۔سر

دھڑ دھڑ دھڑام

فوجیوں کے بھاری بھر کم قدم، ترانے کے الفاظ کے ساتھ قدم ملا رہے ہیں۔

بازو بھی بہت ہیں۔۔۔سر بھی بہت۔۔۔

سامنے سے بہت سے سر اور بازو میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ شاید کوئی جلوس ہے۔۔۔"آگے!" آگے آگے کمانڈر ہے جس نے قائداعظم کی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ یہ تو خود قائد ہیں۔۔۔قائداعظم میں نے پہچان لیا ہے۔ قائداعظم جنہوں نے ہمیں عظیم وطن دیا۔ اپنا گھر۔ Homeland تا کہ ہم خود کو بے گھر کر لیں۔ اسے توڑ پھوڑ کر اس کا سر اور بازو الگ کر دیں۔ Motherland جس کی حرمت کو پامال کر دیں۔۔۔اس کا چاند اور ستاروں سے بھرا آنچل تار تار کر دیں۔۔۔جھنڈا۔۔۔کسی نے جھنڈا اٹھا رکھا ہے۔۔۔یہ تو فاطمہ ہیں۔۔۔فاطمہ جناح۔۔۔فاطمہ میری چھوٹی۔۔۔آنچل۔۔۔چاند۔۔۔ستارہ۔۔۔ایمان، اتحاد۔۔۔تنظیم۔۔۔!

آزادی۔۔۔بڑھو۔۔۔آگے!

کٹتے بھی چلو۔۔۔بڑھتے بھی چلو!

چلتے بھی چلو۔۔۔ڈیرے۔۔۔منزل! آزاد ملک!

دیکھو! یہ ملک ابھی ابھی آزاد ہوا ہے۔۔۔

لاالہ الااللہ۔۔۔

دین کے نام پر آزادی، دین، عدل، انصاف

غیروں سے آزادی، اپنوں کی غلامی۔۔۔نفس کی غلامی۔۔۔

نہیں نہیں یہ ملک ابھی بھی آزاد نہیں ہوا۔۔۔ابھی منزل نہیں آئی۔۔۔

ابھی رکنا نہیں ہے۔۔۔چلو!۔۔۔چلو!

چلو!

پابہ زنجیر

چلو چلو بھئی۔۔۔جلدی کرو۔۔۔جلدی اور دریا میں کود جاؤ!۔۔۔ورنہ!
ورنہ سب کے سب مارے جائیں گے"

دبلے پتلے جونی (Johnny) کا لہجہ "برڈ کال" کی طرح پراسرار سریلا اور ملائم تھا بالکل اس بلاوے کی طرح جو سرراس (Ross) نے جنگل میں بلانے کے لیے آزمایا تھا، مگر کسی فوجی کمانڈر کے آرڈر سے بڑھ کر متیقن اور گھمبیر تھا۔

آن کی آن میں، وہ سب، ایک ایک کر کے دریا میں کود گئے۔

رونی (Rony) سیرا۔۔۔(Sara) اور پیٹی (Petty)۔۔۔انہیں دریا میں ڈوب کر مر جانے کا ڈر نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ جانتے تھے کہ اگر نہیں کودے تو مر جائیں۔ سب کے سب۔۔۔اسی دریا کے کنارے ابھی تو وہ جونی کے بلاوے پر سعادت مندوں کی طرح دریا میں کود چکے تھے۔ جیسے جونی نہیں "جان دی بپٹسٹ" نے انہیں موت کے منہ میں بپتسمہ دینے کے لیے بلایا ہو اور وہ اس مقدس مذہبی رسم کے لیے دل و جان سے تیار کھڑے ہوں۔

پھر نا جانے کتنی دیر وہ چاروں دریائے مسی سپی کی لہروں کے مہربان آنچل تلے سانسیں روکے کھڑے رہے۔۔۔

دراصل یہ طریقہ انہیں بوڑھے جان (John) نے سکھایا تھا جو کپاس کے وسیع کھیتوں کے پرلے کنارے پر۔۔۔خود سے بھی زیادہ خستہ حال کا مپج میں رہا کرتے تھے اور کبھی کبھی، چپکے چپکے، صبح سے شام تک کپاس کے پھول چننے والے ننھے منے سیاہ فام غلام بچوں کو پانی کے چند گھونٹ یا روٹی کے چند ٹکڑے عنایت کر دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ ان بچوں کی ننھی ننھی کھردری ہتھیلیوں پر کوئی بام بھی لگا دیا کرتا۔ جو مرہم عیسیٰ کی طرح ان کی سیاہ چمڑی کے اندر چھپی اجلی روحوں میں اتر جایا کرتی۔

مگر پھر بھی بوڑھے جان نے ان بچوں کو کبھی مسکراتے نہ دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہتھیلی پر مرہم

رکھنے سے قسمت تو نہیں بدلا کرتی۔ نہ جانے کب، کون، کیسے، کوئی ان کی فریادوں کو سن پائے گا، جو ان بچوں کے خشک گلوں میں پھنسی پڑی تھیں۔۔۔ جو ان کی کمزور پسلیوں کے پنجروں میں سکڑے ہوئے پھیپھڑوں میں اٹک کررہ گئیں تھیں۔۔۔!

بس ایسے ہی کبھی بوڑھے جان نے جب وہ جوان تھا، بھاگنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مگر سزا کے طور پر مالک کے Lash نے، بدلے میں اس کی ایک آنکھ وصول کر لی تھی۔ آنکھ کیا گئی، امید بھی ساتھ لے گئی۔ مگر اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل میں یہ عہد کرلیا تھا کہ اپنے لیے نہیں تو کسی اور مجبور سیاہ فام کی رہائی کے لیے وہ اپنی جان بھی دے دے گا۔ مگر زندگی بھر اسے کوئی موقع نہیں مل سکا۔

جس روز غلیظ دانتوں والے موٹے، بھدے فرینک کو جو کپاس کے کھیتوں کا ٹھیکے دار تھا، کو بوڑھے جان کی کارستانیوں کا علم ہوا تو وہ کنارہ ہی غائب ہو گیا جہاں بوڑھے قدیم جان کا پرانا جھونپڑا تھا، جس میں اس کی طویل غلامی کے بعد بخشی ہوئی آزادی کے چند گنے چنے دن مقید تھے۔

جان کے ڈھانچے کو دیکھتے ہی یہ خیال گزرتا کہ گویا وہ Atlantic Slave Trade کے ذریعے، افریقہ سے امریکہ کا سفر کرنے والا شاید پہلا "Slave" تھا۔ اب پتہ نہیں فرینک اور اس کے پالتو کتوں نے ہڈیوں کے اس ڈھیر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟

بس اسی دن سے فرینک کے چنگل میں پھنسے تمام بچے خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ ان کے ننھے دلوں میں امید کی ہر کرن بجھ گئی ہوتی اگر Sir Ross اس علاقے کا رخ نہ کرتے جو پرندوں پر Research کے بہانے، کئی غلام فام بچوں کو "بھگانے" کے مشن پر تھے۔

صرف پہلی Birdcall پر وہ چاروں Plan کے مطابق منہ اندھیرے طے شدہ راستوں سے ہوتے ہوئے دریائے مسی سپی (Missisipi) کے کنارے آ پہنچے تھے اور اب وہ دریا کی لہروں میں سمائے ہوئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ محفوظ ہیں۔ اور ان کے جسموں کی باس Slave-Catchers کے کتوں کے نتھنوں تک نہیں پہنچ سکتی جو صبح ہوتے ہی ان کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

کچھ دیر بعد جونی کے اشارے پر وہ سب پانی سے باہر آ گئے اور جھاڑیوں میں چھپ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگے۔

ہر طرف پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شکاری اور کتے نا جانے

کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ان کے ''کالے سر'' اور ''کالی چمڑی'' سورج کی اجلی شعاؤں میں تپنے لگی تو ان کی جان میں جان آنے لگی۔

اب تک تو ان کے فرار کی خبر پورے قصبے میں پھیل چکی ہو گی! کہیں ظالموں کی دوسری ٹولی انہیں کھوجتے ہوئے یہاں نہ آ پہنچے۔۔۔

ووف۔۔۔ووف۔۔۔ووف۔۔۔

☆☆☆

ووف۔۔۔ووف،ووف،ووف۔۔۔

''اوہو! یہ پالو۔۔۔ پھر سے بھونکنے لگا۔ کیا پھر اسے کوئی جن بھوت دکھائی دے گیا ہے؟''

گویا بوڑھی جولیانا (Juliana) اپنے روبرو، بوسیدہ سے آئینے کے چوکھٹے میں دکھائی دینے والے چاروں بچوں سے مخاطب تھی۔ جو کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر چونک گئے تھے اور ڈر کے مارے آئینے کے باہر جھانکنے لگے تھے۔ خود جولیانا کا چہرہ بھی خوف کے مارے، صدیوں پرانے مجسمے کی طرح تڑتڑانے لگا تھا۔

اس نے آئینہ، ناشتے کی میز پر رکھ دیا اور کھڑکی کی جانب لپکی۔

ووف۔۔۔ووف۔۔۔ووف۔۔۔!

باہر لان میں، پالو بھونک بھونک کر ہلکان ہو رہا تھا۔

شش شش۔۔۔شش۔۔۔! جولیانا کے چلاتے ہی پالو یکدم خاموش ہو گیا۔ جیسے کسی نے اس کا بٹن آف کر دیا ہو۔

پتہ نہیں کیوں کبھی کبھی وہ بھونکتا تو بھونکتا ہی چلا جاتا تھا۔ جیسے کسی پر خوامخواہ غصہ اتار رہا ہو۔ اس کے علاوہ اس نے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی جس کی پاداش میں اسے پاگل قرار دے دیا جاتا۔

ویسے بھی برسوں پرانا ساتھ تھا۔ اگر پالو پاگل بھی ہو جاتا تب بھی جولیانا اس کے ساتھ خوشی خوشی گزارہ کرتی۔ کچھ ایسا ہی لحاظ پالو بھی دکھایا کرتا تھا۔ ایک آواز پر خاموش ہو جاتا۔

جب پالو، سر جھکائے اپنی ٹانگیں پیچھے پیچھے سرکاتا ہوا، باڑ کی آڑ میں دبک گیا تو جولیانا بھی جلدی جلدی اپنی بھاری ٹانگیں سرکاتی ہوئی پھر سے ناشتے کی میز پر آ پہنچی۔ جہاں ایک پلیٹ میں

پین کیک کے بچے ٹکڑے اور ایک بوسیدہ حال آئینہ پڑا ہوا تھا۔

جولیانا نے بے چینی سے بڑھ کر آئینہ اٹھایا اور اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کر لی۔ مگر آئینے کی دھندلائی سطح پر تیرتے ہوئے عکس نا جانے کہاں ڈوب گئے تھے۔۔۔دریا میں۔۔۔نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔جونی رونی۔۔۔میرا۔۔۔بیٹی۔۔۔

مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

جولیانا پھر سے کہانیاں بننے لگی تھی! کھلی آنکھوں سے!" کہاں گئے سب" وہ کسمسائی۔ ابھی تو انہیں اتنا لمبا سفر طے کرنا ہے۔ پتہ نہیں انہوں نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ اس کی نظر پین کیک کے ٹکڑوں پر تھی۔ پتہ نہیں کسی کو جنگل کی جڑی بوٹیوں کی پہچان بھی ہے یا نہیں۔ وہ پریشان ہوتی رہی۔

شام ہونے کو آئی ہے۔ رات ہوئی تو بچے اور بھی ڈریں گے۔ مگر انہیں تو ساری رات چلنا ہے۔ دبے پاؤں۔ کھلے آسمان تلے۔۔۔ستاروں کے جھرمٹ میں! ۔۔۔ Drinking Gourd کو پہچانتے ہوئے۔ جس کی ٹوٹنی پر شمال کا راستہ دکھانے والا ستارہ لٹکا ہو گا۔ جتنا زیادہ فاصلہ رات کو طے کر پائیں گے اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔ دن کو تو خطرہ ہی خطرہ ہوتا ہے ناں! پتہ نہیں کب پہنچ پائیں گے وہ اتنی دور۔۔۔Tennesae۔۔۔پھر Windsor۔۔۔یا پھر St.Catherine۔۔۔کیا ہو گا جو کوئی بیمار ہو گیا۔۔۔کیا ہو گا۔۔۔جو کوئی۔۔۔مر۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔They Will Make it

Save Them!...Oh! God.... They Will...Save`em all!

پھر وہ ہولے ہولے کوئی "Spiritual" گنگنانے لگی جیسے کوئی لوری کی دھن پر۔۔۔ امید کا نغمہ گا رہا ہو۔

O promised Land! We`re coming ...to hug ya...

"I Don`t Want no Trouble"۔۔۔اس نے مخصوص پیرائے میں یہ جملہ ادا کیا جیسے اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر اس "تاریخی آئینے" کو جسے اس نے شاید جہاں نما سمجھ رکھا تھا اور جس میں خود جولیانا کی قدیم شبیہ چپکی ہوئی تھی۔۔۔اٹھا کر میز پر پٹخ دیا اور جھک کر

پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

کمزور، مرجھایا ہوا، ملگجا، سیاہ چہرہ! جس کے اوپر سفید بالوں کا بڑا سا چھتہ دھرا تھا۔ جیسے کپاس کا بڑا سا پھول۔ چھتے کے نیچے، زندگی کا واحد آثار تھیں، اُس کی دو ننھی ننھی، قدرے گول اور سیاہ نگاہیں، جو کبھی کبھی مکھیوں کی طرح متحرک دکھائی پڑتی تھیں۔

ایک لمحے کو جولیانا کو اپنے عکس Nanny of Maroons کا گمان ہونے لگا تھا۔ میرونوں کی نانی!

جس کے مخنی چہرے پر بڑے بڑے عزائم چھپاں رہتے تھے۔ وہ سیاہ فام Chieftainess جس کی نوکیلی نگاہوں میں نیزوں کی سی چبھن تھی اور نا قابلِ تسخیر جنون۔۔۔ جس نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور جو نہ جانے کتنے ہی برس Jamaica کی پہاڑیوں پر، سفید فام Invaders کے خلاف لڑتی رہی تھی۔۔۔اور ابھی تک تھکی نہیں تھی۔۔۔!

ہا! مگر جولیانا کا چہرہ تو تھکاوٹ سے بوجھل تھا۔ اس کے چہرے کی دبیز جھریوں میں غصہ ہی غصہ سمویا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

اس کی ڈرپوک مکھیوں کی طرح بھنبھناتی نظریں، لگتا تھا ابھی کوئی ہاتھ مارے گا اور وہ آنکھوں سمیت، آئینے کی سطح پر سے اڑ جائیں گی۔

بے خیالی میں جولیانا نے گردن جھٹک کر اپنی خوش فہمی دور کر دی۔ اُسے ”تاریخی“ بننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور شاید نہ ہی اسے میرونوں کی نانی کی طرح اپنی اور اپنی نسل کی بقا کی جنگ سے کوئی دلچسپی تھی۔ وہ تو آئے دن کی چھوٹی موٹی اونچ نیچ سے ٹکر لینے کی بھی متحمل نہیں تھی۔

کہاں وہ اور کہاں نانی! جس کے ساتھ شاید قدیم افریقی مذہب پر یقین کرنے والوں کے مطابق Obeah کی غیر مرئی طاقت تھی۔

”کتنی ڈرپوک ہو۔۔۔تم جولی! تم تو شاید ایک مکھی بھی مار نہ سکو گی۔“

یہی کہا کرتا تھا نہ اس کا شوہر ایڈی، جو امریکی بارڈر پر ایسے ہی بقا کی جنگ میں شہید ہوا تھا۔

جولیانا نے اپنے عکس پر آخری نگاہ ڈالی اور آئینے کو ناشتے کی میز پر الٹ دیا۔ اس کی نظر اڑ کر دیوار پر ٹکے پرانے گھڑیال پر جا بیٹھی۔ گھڑیال پر وقت کی سوئیاں قدم قدم لڑھک رہی تھیں

مگر گھڑیال وہیں کا وہیں کھڑا تھا، پرانے زمانے میں۔

کچھ دیر بعد جولیانا، مکان کے عقبی حصے کی سیڑھیوں پر اپنی ٹانگیں سرکا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے اس کا بھاری وجود کسی اونچی پہاڑی سے اترنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پتہ نہیں کب وہ Basement کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ اس کا Metabolism، ٹائی کے طرح تیز ہونے لگا ورنہ وہ تو صدا کی ست الوجود تھی۔

بالآخر وہ جالوں اور گرد و غبار سے اَٹے ہوئے راستے کی تمام تر رکاوٹیں عبور کرتی، ایک بڑے صندوق کے قریب پہنچ گئی۔ جس میں کوئی بیس تیس کے قریب، چھوٹی، بڑی ڈرائنگز اور پینٹنگز محفوظ تھیں۔ اس نے قریب ہی بیٹھتے ہوئے، ہولے ہولے، تصویروں کو اپنے ایپرن سے جھاڑنا شروع کیا۔ گرد اس کے بالوں کے چھتوں میں گھسنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ زور زور سے کھانس رہی تھی۔

☆☆☆

ماں۔۔۔!

ایڈم نے ماں کے کھانسنے کی آواز سن کر مکان کے عقبی حصے کا رخ کیا وہ ابھی ابھی حسب معمول اپنی جاب سے واپس لوٹا تھا۔ راستے میں ایک مقامی سکول سے اس نے اپنی آٹھ نو برس کی بیٹی، کیرولینا (Carolina) کو پک کر لیا تھا۔ آج بھی اس نے تیزی سے، بستے سمیت سے کیرولینا کو اٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دیا تھا۔ جیسے کسی خطرے سے بچانا چاہتا تھا۔ سکول کے لڑکوں کی ایک ٹولی نے سڑک کے کنارے تک ان کا پیچھا کیا تھا۔ جن کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کار کے مڑتے ہی وہ سب بھی واپس مڑ گئے تھے۔

دراصل ننھی کیرولینا کو کچھ عرصہ سے پراسرار چھیڑ چھاڑ کا سامنا تھا۔ بیشتر باتیں وہ سمجھنے سے قاصر تھی مگر ایک آدھ فقرے اسے ضرور یاد رہ جاتے۔ جو Skin Color کے بارے میں تھے۔ ایڈم، کیرولینا کے استفسار پر زیادہ دھیان نہ دیتا کہ کہیں وہ زیادہ ہی پریشان نہ ہو جائے۔ لیکن خود اس آئے دن کی چھیڑ خوانی نے اسے دق کر رکھا تھا۔ اس Harrasment کی شکایت کا فائدہ کہاں تک ہوتا ہے وہ اچھی طرح جانتا تھا بس اسی لیے نظر انداز کرتا جا رہا تھا۔

پچھلے دنوں شہر میں نسلی تعصب کو ہوا ملی ہوئی تھی۔ جس کا سبب ہائی سکول میں ایک گورے بچے

کی حادثاتی موت تھی، جسے اَب Racism کا رنگ دیا جانے لگا تھا۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ چھوٹے موٹے Issues کو لے کر Black اور White کا سوال کھڑا کر دینا، Media کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایڈم نہیں چاہتا تھا کہ کیرولینا پر ان واقعات کا اثر پڑے۔

وہ گاڑی بھگاتا ہوا ماں کے گھر آ پہنچا تھا اور کہاں جاتا تھا! Edward`s Cottage کے احاطے میں داخل ہونے پر پالو نے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ دروازہ کھلا تھا مگر آج حسب معمول جولیانا، اس کی ماں، کچن میں نہیں تھی۔

ایڈم اور کیرولینا ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھ گئے تھے۔ ٹیبل پر کچھ بچے کھچے پین کیک کے ٹکڑے اور ایک پرانا آئینہ الٹا پڑا ہوا تھا، جس کی پشت کا کوئی کالے کالے چھتوں جیسے سروں والا، افریقی ڈیزائن، افریقی تہذیب کی طرح دھندلا رہا تھا۔

کیرولینا نے ڈرتے ڈرتے آئینے کو سیدھا کیا اور پھر آئینے میں جھانک کر شکلیں بنانے لگی۔ ایڈم یہ سوچ کر کہ ماں قریب ہی مارکیٹ میں ہوگی، انتظار کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

"ماں۔۔۔!"

ماں کی کھانسی پہچان کر ایڈم نے پکارا۔

"گولڈی، پٹ اٹ بیک، بے بی۔۔۔"

اس نے کیرولینا کو سرگوشی کی۔ گولڈی نے آئینہ، سیدھا ہی میز پر رکھ دیا اور پھر چپکے چپکے شکلیں بنانے لگی۔

"اکھوں۔۔۔ اَکھوں۔۔۔ کھانسی کی آواز قریب آنے لگی۔ کان کے عقبی حصے سے جولیانا کی شبیہہ ابھری۔ سر جھاڑ، منہ پہاڑ۔۔۔ وہ تو سچ مچ میں میرونوں کی نانی نہیں تو اس کا بھوت ضرور لگ رہی تھی۔ جو شاید امریکہ میں افریقی رسم و رواج اور موسیقی کا ورثہ محفوظ کرنے کی کوشش میں خود بھی حنوط ہو کر رہ گئی تھی۔

گولڈی (Goldie) دادی کا بھبھوت حلیہ دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اچانک اس نے اپنا بٹن خود ہی آف کر دیا۔ پالو کی طرح۔ اسی کوشش میں اسے ہچکی لگ گئی۔ پراسرار، غصیلی نانی، دادی۔۔۔ جو بھی، کے بھوت کے سامنے ایسی جرأت واقعتاً سزا کی مستحق تھی۔

"ماں! تم بیسمنٹ میں کیوں گئیں۔ میں نے کہا تھا ناں کہ کوئی کام ہو تو مجھے بتانا!"

ایڈم نے حسب معمول روایتاً شفقت دکھاتے ہوئے شکایت کی اور بڑھ کر ماں کے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تصاویر کو میز پر رکھوا دیا۔ پھر اپنی ماں اور بیٹی کو پانی پلایا تو کھانسی اور ہچکی کی آوازیں تھم گئیں۔ کچھ دیر بعد تصویروں پر سے اڑا غبار بھی بیٹھ گیا۔

☆☆☆

کئی روز سے ایڈم کی بیوی، اینجی (Angie) مس کیرج کی وجہ سے ہسپتال میں تھی۔ اس لیے وہ سکول سے واپسی پر گولڈی کو ماں کی طرف ہی لے آیا تھا۔ پہلی بار کچھ چاہتے اور کچھ نہ چاہتے ہوئے۔ جولیانا اپنی پوتی کا خیال رکھنے پر مجبور تھی۔ ورنہ ماں کے دبے دبے غصے کے باعث، ایڈم، اینجی اور گولڈی کو ماں سے ملوانے سے کتراتا تھا۔

دراصل ایڈم اور اینجی کی شادی، جولیانا کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ یا یوں کہیے کہ جولیانا کی مرضی اس رشتے میں شامل نہیں تھی۔ اس پراسرار پیچیدگی نے عجیب ماحول پیدا کر رکھا تھا۔

ایڈم تو نہایت فرمانبردار اور غم گسار بیٹا تھا۔ ماں کا قدردان بھی تھا، ہمدرد بھی!

قدردان اس لیے کہ وہ ماں کی گزری زندگی سے واقف تھا۔ وہ اپنے آباؤاجداد کی قربانیوں سے آشنا تھا جو بہت سے دوسرے سیاہ فام خاندانوں کی قربانیوں سے زیادہ مختلف نہ تھیں۔

ہمدرد اس لیے کہ اس کی ماں کبھی کھل کر درد کا اظہار نہ کرتی تھی۔ وہ بہت کم گو تھی۔ اکثر اوقات، سارا سارا دن خاموش رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی رات میں اس کی کھانسی کی آواز، ایڈم کے سوئے ہوئے کانوں تک پہنچتی تو وہ جاگ اٹھتا اور ضرور پوچھتا: "ماں تم ٹھیک تو ہو ناں!" لیکن کبھی کبھی تو۔۔۔ جولیا بولتی تو بولتی ہی چلی جاتی۔ جیسے غصے میں کوئی بے نقط سناتا چلا جائے۔ وہ نان سٹاپ ریل گاڑی کی طرح پٹر پٹر چلتی ہی جاتی۔ کسی سٹیشن پر رکے بغیر!

اس کی باتوں کی رفتار کسی "Underground Rail" سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ جو رکی رکی بھی چلتی رہتی، مگر کسی کو اس کے چلنے کی خبر نہ ہو سکتی۔ کسی Invisible راستے پر دبے پاؤں چلتی ہوئی "ریل گاڑی" کی طرح جس پر ہزاروں سیاہ فام بوڑھے، جوان اور بچے سوار تھے۔ اپنے سروں پر، جھولیوں میں۔۔۔ جیبوں کے اندر آزادی کی امید سموئے۔ ایسی "Rail Road" پر جو انہیں ایک "Promised land" لے جانے کا "وعدہ" تھی۔ Promised Land

جس کا نام Canada تھا!!!!

اس راستے پر Harriet Tubman جیسے کئی "Moses" تھے جنہیں Sir Alxander Ross جیسے "Conductors" کی مدد حاصل تھی۔

تاریخی لحاظ سے ایڈم کے نانا، نانی اسی Josiah Henson کے قریبی ملنے والوں میں سے تھے۔ جن کا خاندان قدم قدم پر تکلیف اٹھا کر بالآخر، کینیڈا پہنچے تھے اور جنہوں نے Dawn Settlement کا آغاز کیا تھا۔ وہی جن کی آپ بیتی سے متاثر ہو کر Harriet Beach نے اپنا مشہور ناول Uncle Tom`s Cabin لکھ ڈالا تھا۔ وہی تحریر جس کے باعث بہت سے سفید فام ہمدرد دلوں میں سیاہ فام مظلوموں کو انصاف دلوانے کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔

☆☆☆

ایڈم کی ماں نے اسے بتایا کہ ایڈم کی مرحوم نانی میں بھی بہت کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا مگر وہ اتنی حوصلہ مند نہیں تھی کہ Mary Ann کی طرح سیاہ فام بچوں کے لیے کوئی سکول ہی کھول لیتی۔ وہ تو ٹیچر بھی نہ بن سکی تھی۔ اسے تصویریں بنانے کا جنون تھا۔ وہ اپنے جذبات کاغذوں پر اتارتی رہتی تھی۔

جب President Lincoln نے امریکہ میں Slavery کے اختتام کا اعلان کیا تو بہت سے سیاہ فام واپس امریکہ چلے گئے۔ مگر جولیانا کے والدین نے تمام تر نسلی امتیازات ہونے کے باوجود کینیڈا کو ہی اپنا وطن مان لیا تھا تاکہ آزادی کے خواب کی ادھوری تعبیر کو مکمل کرنے کی کوشش کر سکیں۔ جس کے باعث سیاہ فاموں کو مذہب، تعلیم اور بہتر ذریعۂ معاش سے دور رکھ کر ان کی بچی کھچی انا کو بھی کچلا جا رہا تھا۔

زندگی جولیانا کے لیے تو حوصلہ اور برداشت کی طویل داستان تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایک سہمی ہوئی بچی تھی۔ پتہ نہیں کب وہ جوان ہوئی اور کب اس کی شادی بھی ہو گئی۔ پھر والدین نہیں رہے اور ایک روز اس کا پیارا خاوند Edward، ایڈی، بھی جنگِ عظیم (دوئم) World war II کی نظر ہو گیا۔ تب ایڈم صرف دو سال کا تھا۔ ایڈی کو تبھی سے جنگ کی دھن لگی ہوئی تھی۔ جب سے اس کے والد کو ورلڈ وار I میں محض نسل پرستی کی بنا پر حصہ لینے نہیں دیا گیا تھا اور نہ وہ ثابت کر دیتا کہ "کالوں" کے "خون" میں بھی ویسی ہی وطن پرستی تھی جیسی "گوروں" کی "چمڑی" میں! ایڈی

اپنا مشن پورا کر گیا مگر جولیانا اور ایڈم کی سزا لمبی کر گیا۔
تب سے جولیانا اور بھی ڈرپوک ہو چکی تھی اور شاید ایڈم کو بھی اس نے اپنے جیسا بنا ڈالا تھا۔
اب 80ء کی دہائی میں تو ایڈم کی ماں چلتی پھرتی کہانیوں کی کتاب تھی، جو چپ چاپ ہی چلتی چلی جا رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ بولتی تو بولتی ہی چلی جاتی جیسے کوئی ٹرین پٹڑ پٹڑ چل رہی ہو۔ ورنہ سارا شور Underground ہی رہا کرتا۔

☆☆☆

ایڈم اپنی ہی ماں پر سوار تھا۔ وہ اتر تا تو اپنے بارے میں بھی سوچتا۔ بس یونہی چلتے چلتے وہ چالیس کی دہائی میں آ پہنچا تھا۔ تب ایک روز اس کی ملاقات اینجلینا (Angelina) سے ہوئی۔ وہ Subway Train میں اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھی۔
"کیا یہ ٹرین North Bound ہے؟ سوری میں نے چڑھتے ہوئے دھیان نہیں دیا!" اینجلینا نے ایڈم کو مخاطب کیا۔
"ہاں! یہ ٹرین North Bound ہی ہے۔" وہ بولا "Underground Railroad کی طرح" وہ بے خیالی میں کہہ گیا۔
جواب میں اینجی نے نہایت معنی خیز مسکراہٹ عنایت کر دی۔
"کیا آپ نے Uncle Tom's Cabin پڑھا ہے؟ اس نے پوچھا تو ایڈم کچھ کھسیانا ہو گیا۔ "نہیں! شاید میری ماں نے پڑھا ہے"۔ "آپ اسی ناول کی بات کر رہی ہیں جو Harriet Beecher نے غالباً 1852 میں لکھا تھا۔" Josiah Henson کی آپ بیتی سے متاثر ہو کر۔ ایڈم نے مزید شرمندگی مٹانے کے لیے اپنی معلومات کا اظہار کر ڈالا۔
"آپ کو معلوم ہے، ابراہام لنکن نے اس ناول نگار کے بارے میں کیا کہا تھا؟" اینجی پھر آگے نکل گئی۔
"جی نہیں"۔ "ایڈم پھر کھسیانا سا ہو رہا۔
'So this is the Little Lady Who Made this Big War!"
اینجی بولی۔
"اوہو۔ تو آپ شاید 1863ء میں ہونے والی Civil War کا ذکر کر رہی ہیں، ج

Slavery کے خلاف ہوئی تھی۔"

"Exactly"۔ اینجی مسکرائی۔

"Ms.Beecher نے ایک بات اور بھی کہی تھی۔"

"کیا؟"

"Under Ground Raid Road is Still Rolling" اور ایڈم کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"Yes! I Believe, it is!"

اور دونوں خاموش ہو گئے۔

"Hi I`m Angie You Can Call me Angie"

اینجلینا نے تعارف کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔

"Hi I`m Adam You Can Call me Adam!" ایڈم نے مسکرا کر اینجی کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں مسکراتے رہے۔

☆☆☆

اینجی، ایک مقامی کالج میں ہسٹری پڑھا رہی تھی۔ اس کا تعلق Levis Coffin کے خاندان سے تھا۔ جسے President of Under Ground Rail Road بھی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ سفید فام ہونے کے باوجود بہت بڑا Abolishist اور Quacker تھا۔ یعنی ان لوگوں کے رہنماؤں میں سے تھا جو اس نازک دور میں سیاہ فاموں کی غلامی کے مخالف تھے۔

ایڈم ایک Elementary School Teacher تھا۔ دونوں کا اپنی اپنی زندگی کی کہانیوں کی بناء پر ایک دوسرے سے متاثر ہونا، ناگزیر تھا۔

اتفاق سے، دونوں ہی ماضی میں Africville میں ہونے والے حادثے کے Protest میں شامل تھے۔ جس میں Malcom-X ایک اہم شخصیت کے طور پر برسرِ پیکار تھا جسے مسلمان ہونے کی وجہ سے دوہری مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

Martin Luther king II دونوں کا Favourite تھا۔

جس کی مشہور تقریر۔۔۔I`ve a Dream نے نسلی امتیاز کا لبادہ تار تار کر ڈالا تھا۔

چند ایک رسمی ملاقات کے بعد ایڈیم، اینجی کو ماں سے ملوانے لایا۔ پوری ملاقات میں ایڈم کی ماں Underground ہی رہی۔ اینجی سمجھ سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے ایڈم کو Avoid کرنا شروع کر دیا۔ شاید اسی رویے کا ردعمل تھا کہ ایڈم کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ شاید پہلی بار وہ ماں سے الگ ہو کر سوچنے لگا تھا اور پھر ایک روز ایڈم نے ماں کی اجازت کے بغیر ہی اینجی سے شادی کر لی۔

جولیانا نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اور خاموش ہو گئی! چند برس بعد، گولڈی پیدا ہوئی تو ایڈم کو ماں کے رویے میں تبدیلی کی امید ہوئی۔ مگر جولیانا جب بھی گولڈی کو دیکھتی اور بھی چپ سادھ لیتی اور Palo جس کا نام پتہ نہیں کس قدیم بلا پر رکھا گیا تھا۔ بھونکنا شروع کر دیتا۔ شاید وہ احتجاج کرتا

"جولی تم ٹھیک نہیں کر رہی!"

☆☆☆

آج بھی تو وہ بھونکتا ہی جا رہا تھا۔ جولیانا نے کھڑکی میں جا کر اسے اشارہ کیا تو وہ خاموش ہو گیا اور اپنے پیر سرکاتا ہوا جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔

ایڈم کے ہاسپٹل چلے جانے کے بعد، جولیانا نے گولڈی کا ہاتھ منہ دھلوایا کپڑے تبدیل کیے اور پھر ہوم ورک کروانے لگی۔

یوں تو گولڈی ابھی بہت چھوٹی تھی، مگر عقل سے نہیں! اس نے ڈرتے ڈرتے دادی سے سوال کر ڈالا۔

"Granny, Why Does the Skin Color Matter So Much?"

شام سے، گولڈی کے ذہن کے پردے پر Mean لڑکوں کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

جولیانا نے نظر گھما کر معصوم سی گولڈن گڑیا کو دیکھا جو بظاہر، ناشتے کی ٹیبل پر پڑے آئینے میں شکلیں بنانے میں مصروف تھی۔ جس کی جلد ہی کا نہیں، بالوں اور آنکھوں کا رنگ بھی سنہرا تھا۔

"You Know this Color is a Shame to You!!!"

جولیانا کے کانوں میں ہمسائے کا فقرہ گونجا، گورا، موٹا، بھدا، مائیک جو ہر وقت نشے میں دھت اس کے شوہر Eddy پر آوازیں کستا رہتا تھا۔ ایک روز ایڈی نے تنگ کر اسے کہہ ڈالا۔

"It means you have no shame Since you are colorless!"

اس واقعے کے بعد بہت سے سیاہ فام جو اسی Neighbourhood میں رہتے تھے، کی

شامت آ گئی۔ گورے پولیس آفسروں نے خوامخواہ ہی کالے نوجوانوں کو "دھرنا" شروع کر دیا۔ جو بے چارے پہلے ہی نسلی امتیاز کے باعث مایوسی کا شکار تھے اور نہ جانے کن کن "حماقتوں" میں پڑے ہوتے تھے۔ بیشتر کو Drugs Cases میں "ملوث" کر لیا گیا تھا۔

جب ایڈی شہید ہو گیا تو ایک روز مائیک معافی مانگنے آیا تھا مگر جولیانا خاموش رہی تھی۔

پھر ایک روز پتہ چلا کہ مائیک شراب کے نشے میں اول فول بکتا، کرسی پر معذوروں کی طرح بیٹھا بیٹھا ہی عدم سدھار گیا۔

وہ تو اپنے آپ سے بھی نہیں لڑ پایا۔ جولیانا اداس ہو گئی۔

گولڈی کی آواز نے اسے چونکا دیا! "Granny!"

جولیانا کو جیسے ہوش آ گیا مگر اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ آنکھیں جھپکاتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ناشتے کی میز پر چھوٹی بڑی تصویریں پھیلی ہوئی تھیں۔ گولڈی Nanny of Maroon کی تصویر دیکھ کر مسکرانے لگی۔

بقایا پر غلامی کی داستانیں رقم تھیں۔

ایک تصویر پر بہت سے سیاہ فام ایک ساتھ زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ جنہیں Coffles کہا جاتا تھا۔ انہیں بڑے بحری جہاز سے نیچے اتارا جا رہا تھا۔ ایک تصویر میں ایک کم سن سیاہ فام غلام پر کوڑے برسائے جا رہے تھے جس نے غلامی کی زنجیر کو توڑ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ایک تصویر میں ایک جوان سیاہ فام عورت جس کا لباس تار تار تھا، کی بولی لگائی جا رہی تھی۔

جولیانا نے کچھ بڑبڑانا شروع کیا۔ وہ بولتی رہی نان سٹاپ، کسی ٹرین کی طرح پٹر پٹر۔۔۔ مگر پالو خاموش رہا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ایک تصویر پر دیکھ کر ہانپ رہا تھا۔ تصویر میں شکاری کتے منہ کھولے، کسی کھوج میں مصروف تھے۔

☆☆☆

ہسپتال سے واپسی پر ایڈم کی نظر کچن کی کھڑکی سے، اس منظر پر پڑی۔ اس کی آنکھ میں آنسو آنے لگے۔ اس نے آہستہ سے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک ٹکٹ برآمد کیا۔ ڈاک کے اُس ٹکٹ پر Josia Henson کی تصویر چھپی تھی۔ جو پہلی بار Canadian حکومت کی جانب سے دیئے جانے والے Tribute کے طور پر تھی۔ اگرچہ یہ Anti Discrimination کا

قانون پاس ہونے کے بیس سال بعد ہو پایا تھا۔ مگر ہوا تو تھا۔

اور آج اسے ماں کو یہ یقین دلانا تھا کہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ دنیا بدل رہی ہے۔ سوچ بدل رہی ہے۔ ظلم مٹ کر رہتا ہے۔ تاریخ نے یہ بات کئی بار دہرائی ہے اور دہراتی رہے گی۔

ہر انسان آزاد ہے۔ کوئی کسی کا غلام نہیں، ایڈم کو تو خود بھی یہ باتیں کبھی صحیح طور پر سمجھ میں نہ آ سکی تھیں۔ وہ ماں کو کیا سمجھاتا۔ مگر آج اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ وہ بولتا جا رہا تھا۔ بے نقط، نان سٹاپ۔ پٹر پٹر۔۔۔

اگرچہ جولیانا اب بھی مطمئن دکھائی نہ دیتی تھی۔ پھر بھی ڈاک کے اس ٹکٹ کو دیکھ کر وہ ایک بار ضرور ہو گئی تھی۔ پھر اس نے پہلی بار اینجی، اپنی بہو کی طبیعت کے بارے میں پوچھا جو ابھی تک اسقاط حمل کی پیچیدگی کے سبب ہسپتال میں ہی تھی اور جب جولیانا کو یہ معلوم ہوا کہ اب اینجی دوبارہ ماں نہیں بن سکے گی تو اس کا سارا غصہ یکدم رفو ہو گیا۔

☆☆☆

Eddy`s Cottage میں اگرچہ صرف چند برس ہی ان سب کو مل کر رہنا نصیب ہوا۔ مگر وہ ان سب کی زندگیوں کا بہترین وقت تھا۔ سنا تھا کہ جولیانا نے اپنا سارا پیار پوتی پر نچھاور کر ڈالا تھا۔ اس کے چہرے کی دبیز جھریاں بھی نرم پڑ گئیں تھیں اور اس کی جگہ Nanny of Maroons کے چہرے جیسا اطمینان اور یقین جھلکنے لگا تھا۔ سنا تھا کہ پالو نے بھی بھونکنا بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

جولیانا کو گزرے آٹھ، نو برس ہونے کو آئے ہیں۔ پالو بھی اس کے بغیر نہ جی سکا تھا۔

فروری 1995ء کو Black History Month قرار دے دیا گیا ہے۔ گولڈی کی یونیورسٹی میں پہلی بار Black History پر مبنی تصاویر کی نمائش جاری ہے۔ جس میں اس نے اپنی پردادی، جولیانا کی ماں کی بنائی ہوئی تصاویر بھی شامل کی ہیں۔ آج گولڈی کو اپنی تاریخ پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔ لوگ اسے Black ہی شمار کرتے ہیں۔

آج وہ بلیک ہونے کا قرض اتار کر خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہی ہے۔ وہ بہت خوش ہے۔

یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس نے نمائش سے متعلق Banners بنا رکھے ہیں۔ جس میں نسل پرستی

کے خلاف نعرے درج ہیں۔ کچھ پر دیگر مذاہب کی تعلیم بھی، اسی حوالے سے اکٹھی کی گئی ہیں۔
ایک پوسٹر کافی دلچسپ ہے، جو بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔
اس میں مختلف نسل کے لوگوں کو Coffles سے بندھا دکھایا گیا ہے اور نیچے یہ سلوگن درج ہے۔ ایک پہیلی کی طرح۔

What Was the Color of Adam?

آدم کا رنگ کیا تھا؟
اینجلینا اور ایڈم بھی نمائش دیکھنے آئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہیں۔ خود کو ہلکا ہلکا محسوس کر رہے ہیں۔ جیسے کوئی قرض اتر گیا ہو۔ مگر اندر ہی اندر دونوں جانتے ہیں۔

Under ground Rail Road is Still Rolling.......

نسلی امتیاز کے خلاف ایک نا ختم ہونے والی جہدِ مسلسل کی طرح۔۔۔!!!

جنت

"جینی! میں تم سے۔۔۔"

پیانو کے تسلسل سے بکھرتے ہوئے سُروں میں جیسے کوئی Flat Note آ رُکا تھا مگر اس نے کمال مہارت سے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے سنبھال لیا تھا۔

اپنی Practice کے نئے Level پر پہنچنے کے لیے، اسے کچھ طے شدہ دھنوں پر عبور حاصل کرنا تھا۔ مگر وہ محض اس لیے تو پیانو پر نہیں آ بیٹھا تھا کہ چند روز بعد اس کا Test تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اسے پیانو کی موسیقی سے دلی اور ذہنی سکون ملتا تھا۔

اسے پیانو سے محبت تھی۔ شاید پیانو کو بھی اس سے محبت تھی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ جس سرعت اور مہارت سے اس کی انگلیاں پیانو کی Keys پر اثر انداز ہوتیں، اتنی ہی انسیت سے Keys بھی اس کی انگلیوں کو Response کرتیں! اسے یقین تھا یہ محبت اور دوستی، لافانی ہے۔

کچھ دیر بعد ہی اس کا دل اور ذہن Tension سے آزاد تھا اور وہ Right اور Left، سائیڈوں کی کشمکش کو سنبھال لینے میں قدرے کامیاب ہو چکا تھا۔

اس نے کمرے کی لائیٹس آف کر دیں اور کچن ٹیبل کے عین وسط میں اپنی پسندیدہ خوشبو والی موم بتی جلا کر اسے دیکھنے لگا۔ جس کی موم پگھل پگھل کر اس کے اپنے ہی وجود کے اطراف میں، ایک بے ہنگم ڈھیر کی شکل میں جمع ہو رہی تھی۔ حسرتوں اور خواہشوں کا ڈھیر جو انسان کے وجود کے اردگرد پھیلتا ہی چلا جاتا ہے، جو نہ اس کی زندگی کے دورانیے میں کمی کر سکتا ہے نہ اضافہ! بس پھیلتا چلا جاتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے اور پھر اسی ڈھیر کے درمیان جل جل کر ایک روز زندگی کی لو، گل ہو جاتی ہے۔

اچانک کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے موم بتی بجھا دی۔

سردی کی لہر اس کی Hoodie کے کھلے گریبان کی دعوت پر اندر چلی آئی، جو وہ بس ایسے ہی زیب تن کیے رکھتا تھا۔ موسم کا کیا تھا کب بدل جائے۔ اس کے سرد ہوتے ہوئے جسم نے ایک جھرجھری لی اور اس نے اٹھ کر کھڑکی کی بند کر دی۔

پھر نا جانے کب وہ گرم گرم بستر میں چین کی نیند سو رہا تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں سے کمرے کی فضا میں ہلکی موسیقی پھیلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

نہ جانے رات کے کس پہر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ دل و دماغ پر پھر وہی بے چینی اور تناؤ چھانے لگا تھا۔۔۔ سوچ کے سُر بے یقینی کی کیفیت میں دائیں بائیں ڈول کر بے سکون ہونے لگے تھے اور اس کے فیصلے کی قوت نے Middle C کا توازن کھو دیا تھا۔

اس نے جیکٹ چڑھائی اور ایک کمرے کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔ چلتے چلتے وہ پل پر آ کھڑا ہوا۔ جس کے نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ ماحول کی پراسرار تاریکی میں ہلکے سروں پر بہتا دریا۔ دریا کے دونوں اطراف میں اس پہر میں ٹریفک کے ریلے بہہ رہے تھے۔ ایک طرف سفید بتیوں اور دوسری طرف سرخ بتیوں کا ریلہ۔ ایک دریا کی سمت میں اور دوسرا مخالف تھا۔

سنا تھا بہت سال پہلے دریا نے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کون سے محرکات دریاؤں کا رخ تبدیل کر دیتے ہیں۔ مگر سمجھ سکتا تھا کہ زندگی بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ کبھی کبھی!

ٹریفک کے مسلسل شور کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ راتوں کو جاگ اٹھتا اور اپنے بیچلر اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر، جس کے شیشے بظاہر ساؤنڈ پروف تھے، یونہی چپ چاپ آتی جاتی آمدورفت کو دیکھا کرتا، جن پر دوڑنے والی گاڑیاں رات گئے سڑک کو جگائے رکھتی تھیں۔ آمدورفت کے ان ریلوں میں سینکڑوں، ہزاروں لوگ، وقت کے پہیوں پر سوار محوِ سفر تھے۔

کیا زندگی میں یہ سفر اتنا ہی ضروری تھا کہ انسان اپنی راتوں کو بھی بے سکون کر لے؟ رات کے پچھلے پہر، شاید چند ہی گھڑیاں ایسی ہوتیں جب سڑک کا ہجوم چھٹتا دکھائی دیتا۔ وہ لمحے بھی کبھی جاگتے، کبھی سوتے اور کبھی سوچتے سوچتے گزر جایا کرتے۔

سنا تھا کہ درخت آوازوں کا شور جذب کر لیتے ہیں۔ کسی اچھے Listener کی طرح ساری آوازیں، پی جاتے ہیں مگر کچھ نہیں بولتے۔ قدرت کتنی مہربان ہے۔ اس نے انسان کے ہر مسئلے کا

حل، مسئلہ پیدا ہونے سے پہلے ہی دے رکھا تھا۔Noise Pollution کا بھی! مگر انسان ہے کہ مسائل پیدا کرنا جانتا ہے، حل کرنا نہیں، پہلے سہولت اور آسائش کے نام پر ایسی ایجادات کرتا ہے جو قدرت کا توازن بگاڑ دیتی ہیں۔ پھر ان کے حل سوچ سوچ کر مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ پتھروں کے شہر آباد کرتے کرتے نہ جانے کتنے جنگل اجاڑ دیتا ہے۔ انسانی زندگی پر کتنے درخت قربان ہو گئے کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ درختوں کے بغیر تو جنت کا تصور بھی ادھورا رہ جاتا ہے۔

اگر انسان شور مچا سکتا ہے تو اسی دنیا کے دوسرے باسی اپنا منہ کیوں نہیں کھولتے۔ اگر انسانی کان کی Sensitivity کا Threshold چند Decibles کے اتار چڑھاؤں سے متاثر ہو سکتا ہے تو ایئرپورٹوں کے گرد لگائے درخت، جو آوازوں کا شور پینے کی غرض سے استعمال کیے جا رہے ہیں، احتجاج کیوں نہیں کرتے۔۔۔ کیا خاموشی کا احتجاج سننے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں! اسی لیے تو انسان اتنا بے حس ہو چکا ہے۔

اسی لیے تو طرح طرح کے دماغی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ قدرت کے سروں کو تباہ و برباد کر لینے کے بعد اسے مصنوعی موسیقی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تاکہ اپنے Clinical Depression سے باہر نکل سکے۔ انسان کا طرزِ عمل کس قدر متضاد اور متنازعہ ہے۔

☆☆☆

سڑک پر کھڑے کھڑے یہ سب سوچنے سے کیا حاصل۔ اس نے بیزاری سے اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ پل پر کھڑے رہنے سے وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ وہ واپس کمرے میں آ گیا۔ ہائی رائیز بلڈنگ کے مقابلے میں درختوں کے قد بہت چھوٹے تھے اور ساتویں فلور پر کھڑے، اسے یوں لگ رہا تھا کہ سڑک پر ہی کھڑا ہے۔ کبھی کبھی مکانی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ اس اپارٹمنٹ میں چند ماہ قبل ہی Move ہوا تھا۔ ابھی اسے تنہائی کی عادت نہ تھی پھر بھی وہ صرف کرایہ بچانے کے لیے کسی سے بھی اپنی Privacy Share کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کسی غلط روش پر تھا۔

ویسے وہ کبھی الگ نہ ہوتا اگر اس کی ماں نے دوسری شادی کا فیصلہ نہ کر لیا ہوتا۔ مجھوٹا ہی سہی مگر فیملی کا آسرا تو تھا۔

اب اسے روکنے والا تھا بھی کون!

☆☆☆

''طوطیا من موتیا! تو ایس گلی نہ جا۔۔۔!''

چائے کے کپ میں، دادی کا مٹیالا چہرہ تیرنے لگا۔ اسے کافی پسند نہیں تھی ورنہ شاید ایسی بازگشت کہیں کھو جاتی۔ دادی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور مسکراہٹ میں چینی گھلی ہوئی تھی۔ چہرہ مٹی کے برتن کی طرح نرم نرم تھا جس پر پیار سے بھری دو موٹی موٹی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے نمی تیرتی رہتی تھی۔ دادی! جن کی گود سے مٹی کی سوندی سوندی خوشبو اٹھا کرتی تھی۔ جو بارش میں بھیگنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

دادی کو بارش میں بھیگنے کا کتنا شوق تھا۔ وہ بان کی پیڑھی کے بل بوتے پر اپنا بھاری بھرکم وجود لے کر پورے صحن میں گھوم جاتیں اور بانس کے لمبے جھاڑو سے پانی اڑا اڑا کر بارش کے پانی سے سارا صحن دھو ڈالتیں۔ ننھا عاقل، ایک بنیان اور نیکر میں جھاڑو پر سے کبھی ادھر اور کبھی اُدھر ٹاپتا، اس کوشش میں کہ جھاڑو کو روک لے گا۔ مگر جیسے ہی اس کے ننھے پیر جھاڑو پر پڑتے وہ بھی گر جاتا اور دادی قہقہہ لگا کر ہنس پڑتیں۔ ان کی ہنسی میں ان کے ہاتھ سے لگے پیڑ پودوں کی تازگی تھی۔ وہ بظاہر ڈانٹ رہی ہوتیں، مگر ہنستی ہی جاتیں۔۔۔

''توکھلوندا نئیں۔۔۔ کی ناں لیندا۔۔۔'' (تم رکتے نہیں۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا۔۔۔) یہ ان کا Style تھا۔

''عاقل'' بڑی امی۔۔۔ ہاہا۔۔۔ آپ ہی نے تو رکھا تھا ناں! بھول گئیں!

''چنگا چنگا۔۔۔ تجھے عقل کب آئے گی عاقل؟ عقل کر!

''کبھی نہیں!'' وہ اور تنگ کرتا اور پھر سے پھسل جاتا، جان بوجھ کر! دادی کو ہنسانے کے لیے۔

''اوئے شاواش!۔۔۔'' اور وہ ہنس پڑتیں اور پنجرے میں لٹکا ہوا طوطا بھی۔ پھر وہ اپنی پسندیدہ نظم گنگنانے لگتیں۔

''طوطیا من موتیا۔۔۔ تو ایس گلی نہ جا!''

''ایس گلی دے لوک برے نیں۔۔۔

لیندے پھائیاں پا۔۔۔!''

''طوطیا من موتیا!۔۔۔

طوطیا من موتیا!۔۔۔"

طوطا بھی گانے کے الفاظ دہراتا رہتا!

دادی کو موسیقی۔۔۔سے لگاؤ تھا۔ وہ اکثر ریڈیو پر موسیقی سنتے سنتے ہی باورچی خانے کے چھوٹے بڑے کام نپٹاتی رہتی۔ مگر دادا جی کی موجودگی میں وہ کبھی ریڈیو آن نہ کرتیں۔ ان کے خیال میں یہ غیر اسلامی تھا۔

کام سے فراغت کے بعد دادی سب کے لیے چائے بناتیں اور خود ہلکی ہلکی، سُڑک سُڑک میں سارا پیالہ ختم کرتیں۔

مٹھو بھی سُڑک سُڑک کی نقل اتارتا۔۔۔ پھر وہ کہتیں۔۔۔"تو کھلونداتیں کی ناں لعید۔۔۔!"

"عاقل" مٹھو کہتا۔۔۔ اور سب ہنس پڑتے!!

☆☆☆

باہر گلی میں کھیلتے کھیلتے کبھی کبھی عاقل گلی کے آخر تک پہنچ جاتا جو آگے سے بند تھی۔ تو ایسی ہی صدا سنائی دیتی۔۔۔"نہ جا!"

اسے بند گلیوں اور بند راستوں سے ڈر لگنے لگا تھا جن کے آگے کیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا۔

لیکن کامل صاحب، عاقل کے ابو جی کو تو کبھی ڈر نہیں لگا۔ آگے بڑھنے سے یا بند گلیوں کے پار جھانک لینے سے۔ انہیں ہر اس راستے میں دلچسپی تھی جو انہیں آگے بڑھا دے اور آسائشوں کی طرف لے جائے۔

انہیں اس کی خاطر پتھریلی عمارتوں اور بند کھڑکیوں کی جنت میں رہنا بھی قبول تھا۔ چاہے جہاں ایک بھی درخت نہ ہو۔ انہیں درختوں سے دلچسپی نہ تھی اور شجر ممنوعہ جیسے درختوں سے تو بالکل بھی نہیں۔ ان کے نظریے میں جنت ایک تجرباتی حیثیت رکھتی تھی جہاں شجر ممنوعہ جیسی چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں عارضی پیمانے تھے۔ ان کے ہونے نہ ہونے سے صحیح اور غلط پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور نہ ہی اچھے اور برے فیصلوں پر۔۔۔

وہ تو کوئی طوطیا من موتیا تھے جن کے مَن میں دور، دیسوں کی جانے کون سی گلیوں، کوچوں کے خواب سمائے ہوئے تھے۔ جو جنت سے بھی زیادہ حسین تھے۔ جہاں کسی بابا آدم اور اماں حوا کے

لیے کوئی غیر ضروری امتحان اور نا گوار تجربہ نہیں تھا۔ سو انہوں نے اپنے والد کی جائیداد بیچ کر کوئی ایسا کاروبار چلا لیا کہ خود بھی ملکوں ملکوں چکر لگانے لگے۔ پھر ایک روز فلائٹ پر وہ خود بھی ایک ''ہائی فائی'' ایئر ہوسٹس کے چکر میں پھنس گئے۔

☆☆☆

ایئر ہوسٹس روزینہ بیگم جن کے والد خود بھی مقامی ایئر لائینز میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے کسی اعلیٰ بزنس مین کے متلاشی تھے۔

یوں ایک روز، روزینہ بیگم بھی پرانے زمانے کی جنت میں داخل ہو گئیں۔ پھر انہوں نے گھر کو بھی جہاز میں تبدیل کرنے کی کوشش میں گھر کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا۔ دروازے بند کھڑکیاں بند کہ Dust Alergy تھی۔

پرانے پھول پودے اور بیلیں بھی اکھاڑ دیں اور میاں مٹھو کو بھی اڑا دیا، بارش میں بھیگنے اور سُڑک سُڑک کر کے چائے پینے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

پھر بھی جب وہ سارے Set-up سے مطمئن نہ ہوئیں۔ تو پردیس جانے کا Plan بنا لیا۔

دادا، دادی زیادہ دیر تک مصنوعی جنت کی گھٹن نہ سہار سکے اور جلد ہی عدم سدھار گئے اور ان کا خاموش احتجاج بھی ان کے ساتھ ہی در گور ہو گیا۔

اب یہ قسمت کی ستم ظریفی کہیے کہ بہت جلد ہی بیرونِ ملک حاصل ہو جانے والی نام نہاد جنت کی تصویر کے چوکھٹے سے، کامل میاں کی شبیہہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔

☆☆☆

ہوا یوں کہ ایک روز، کسی بزنس ٹور پر ان کا چھوٹا سا Plane، تکنیکی خرابی کے باعث Crash ہو گیا، جس میں ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے تھے۔

کچھ عرصہ روزینہ بیگم کی زندگی پر جو اب روزی کہلانے لگی تھیں رسمی سی سوگواری طاری رہی۔

پھر جب انہیں ہوش آیا تو وہ بنا جہاز ہی آسمان پر اڑنے لگیں اور انہیں کسی قیمت پر زمین پر اترنا گوارہ نہیں تھا۔ دراصل وہ اپنی مرضی چلانے کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ کسی دوسرے کی مرضی پر چلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کے زندگی کا تصور ''آسائش'' کے بغیر نامکمل تھا اور اس تصور میں وہ خود غرضی کی حد تک اکیلی تھیں۔ انہیں رشتوں یا انہیں نبھانے کے تکلف سے کوئی خاص دلچسپی

نہیں تھی۔انہیں صرف اپنی جاب کی پرواہ تھی، جو جہازوں ہی کی ایک کمپنی میں تھی۔

انہوں نے عاقل کو ہر آسائش دی۔مگر اس سے "ماں" چھین لی اور جنت جو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے، عاقل کو اس کا علم بھی نہ ہو پایا تھا۔

Baby Sitter اسے سکول چھوڑ آتی اور بعد میں Pick بھی کر لیتی کیونکہ ماں کی جاب کا Schedule متعین نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ عاقل کو ماں کے چہرے کے نقوش بھی بھولتے جا رہے تھے۔اسے یاد تھا تو یہ کہ اس کے اپنے چہرے کے نقوش اس کی دادی پر گئے تھے اور یہ احساس جنت کی ہوا جیسا تھا۔

اس کی چھوٹی چھوٹی بچی کچھی یادیں ان اٹھنیوں، چونیوں کی طرح تھیں جو کبھی دادی کے ململ کے دوپٹے کے پلو میں بندھی رہتیں اور پھر ایک ایک کر کے عاقل کی مٹی کے غلے میں ڈال دی جاتی تھیں۔ایسا ہی ایک غلہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی محفوظ تھا۔

☆☆☆

کامل میاں کے انتقال کے بعد کافی عرصہ عاقل اور اس کی ممی دو اجنبیوں کی طرح اس مکان میں رہتے رہے جس کی Mortgage کا بوجھ روزینہ بیگم پر آ چکا تھا۔اچھی آمدن کی وجہ سے انہیں مشکل نہیں ہوئی۔مگر عاقل کے بڑے ہوتے ہی انہوں نے وہ مکان بیچنے کا ارادہ کر لیا اور اس کے لیے انہوں نے بیٹے سے پوچھنا بھی گوارہ نہ کیا تھا۔لیکن جس روز انہوں نے عارضی طور پر Travel Agency والے مسٹر ڈینیل Daniel کے ہاں منتقل ہونے کا Plan عاقل پر منکشف کیا، وہ گھر چھوڑ آیا۔ویسے بھی انفرادی آزادی کا حق دونوں کو حاصل تھا۔اس لیے کوئی بحث نہ چھڑی۔

"عاقل ڈارلنگ، زندگی صرف آگے کی طرف چلتی ہے۔پیچھے کی طرف نہیں، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے رہنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔زندگی کو موت کی طرح گزارنا کہاں کی عقل مندی ہے۔۔۔ویسے تم چاہو تو تم ہمارے ساتھ۔۔۔!"

مس روزی نے تھوڑی دیر کے لیے، بند کھڑکیوں والے اپنی زندگی کی جہاز نما گاڑی سے سر باہر نکالا۔۔۔مگر عاقل کب کا جا چکا تھا۔

☆☆☆

عاقل کالج Attend کے بعد ایک Grocery Store پر جاب کرنے لگا۔ جہاں کی آبادی ملی جلی تھی۔اس کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ورنہ جس Posh علاقے میں وہ اب تک رہائش پذیر تھا۔وہاں تو گورے ہی گورے تھے یا پھر ان کی چال چلنے والے چند کالے اور سلونے کوئے۔۔

Grocery خریدتے ہوئے لوگ بار بار ڈبوں پر سے Ingredients پڑھتے اور Lecithin اور Gelatin کے بارے میں استفسار کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ ان کا تعلق مسلمان گھرانوں سے ہوگا۔

ویسے سب کا انداز الگ الگ تھا۔کوئی سادگی سے پوچھتا: "Is There Pork in It" تو ہنسی بھی آتی اور افسوس بھی ہوتا! ایک ''دیسی'' دکاندار اکثر گوشت کے سیکشن سے سیل پر لگا ہوا سستا حرام گوشت اپنی دکان پر حلال کہہ کر بیچنے کے لیے خرید کر لے جاتا۔تب سب حرام، حلال گڈمڈ ہو جاتا۔

اسی روٹین میں ایک روز عاقل کی زندگی میں جینی نے قدم رکھا۔وہ ''نومسلم'' تھی اور Meat کے حلال سیکشن میں خریداری کر رہی تھی۔اس نے عاقل کو پہچان لیا تھا۔''تم Humber میں ہو؟''

''ہوں!'' عاقل نے مختصر جواب دے کر جان چھڑانا چاہی۔''میں بھی!'' اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ''!Nice to Meet You'' اس نے خوش دلی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور عاقل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

یوں تو عاقل کے اور بھی Friends تھے۔مگر اس نے کبھی کسی کو اپنی زندگی میں داخل ہونے نہ دیا۔اس کی وجہ صرف اس کی نجی زندگی کی پیچیدگیاں نہیں تھیں Confusion تھا، دراصل وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا، کنفیوژ ہی ہوتا گیا تھا اور یہ کنفیوژن معاشرے میں سوچ اور عمل کے تضاد کا تھا۔غیر منطقی، سماجی اور مذہبی Taboos تھے جنہوں نے فطری معیار کی شکل بگاڑ رکھی تھی۔ ہر طرف کھوکھلا پن اور Fakeness تھی۔جس سے سب اچھا برا، مضر مفید، گناہ، ثواب، جنت، دوزخ خلط ملط ہو گیا تھا۔معاشرہ عجیب قسم کی افراط اور تفریط کا شکار تھا۔اس لیے وہ محتاط تھا! وہ اپنی زندگی کو مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتا تھا۔

اس لیے تو ہر وقت وہ اپنے اوپر ''احتیاط'' کی Hoodie چڑھائے رہتا۔Facebook پر

بھی Fake لوگوں کی بھرمار تھی۔ اس لیے وہ بہت جلد Chatting سے بیزار ہو جاتا اور پیانو پر آ بیٹھتا۔ پیانو کے سُر اس کی Mental Therapy کرتے اور اس کے اعصاب پر سوار جھوٹ کا سارا تناؤ مساج سے دور کر دیتے، اس کی روح کو وہی سکون حاصل ہو جاتا جو شاید جنت میں ہی مل سکتا تھا۔

لیکن جب اس کی ملاقات جینی سے ہوئی تھی۔ اسے Chatting میں مزا آنے لگا تھا۔ وہ مذہب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اسے کسی نے بتایا ہی نہ تھا۔ جب بھی جینی اس سے مذہب کے بارے میں کوئی گفتگو کرنا چاہتی۔ وہ کترا جاتا۔ اس نے تو قرآن بھی ختم نہیں کیا تھا۔ ہفتے میں ایک دو بار آنے والے قرآن ٹیچر بھی مایوس ہو گئے تھے۔ اسے قرآن کی کتاب کا صرف ایک لفظ یاد ہو گیا تھا اور وہ تھا ''لا''۔ وہ جانتا تھا کہ Stop Sign جیسا یہ لفظ حد بھی ہے اور معیار بھی۔ دین کی ابتداء ہی لا سے ہوتی ہے اور اسی پر عمل انتہا میں جنت کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی حکم ہیں۔ ان میں مصلحت اور مصالحت کی گنجائش موجود ہیں۔

اس لیے اس نے جینی سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے ابھی تک اپنا نام تبدیل کیوں نہیں کیا تھا۔ یا کبھی کبھی وہ حجاب کیوں اتار دیتی ہے۔ چند برس پہلے حجاب نہ پہننے پر کسی مسلمان باپ نے بیٹی کا گلہ گھونٹ دیا تو وہ جان گیا تھا کہ کن لوگوں کو چودہ سو سال پہلے بھی اسلام کی سمجھ نہ آ سکی تھی اور ان کے ذہنوں پر پڑا ہوا جہالت کا حجاب آج بھی کیوں اتر نہیں سکا تھا۔

انسان کا حلیہ بھی معنی رکھتا ہے مگر کتنا؟ ورنہ دونوں اطراف کی Extremes بھی کوئی معنی نہیں رکھتیں کہ عورت کو کالا غلاف چڑھا کر آنکھوں سے اوجھل کر دیا جائے۔ اس کے منہ پر نقاب ہاتھوں میں دستانے اور پاؤں پر موزے چڑھا دیئے جائیں۔ ایسے لوگ ذہنی طور پر بیمار ہیں۔ جنہیں اگر یہ کہا جائے کہ کعبہ کے غلاف کا رنگ سیاہ سے تبدیل کر دیا جائے تو وہ آپ پر کفر کا فتویٰ لگانے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

Taboo!۔۔۔ دوسری طرف اگر اتنے مذاہب اور اخلاقی ضابطوں کے باوجود آج انسان، ننگوں اور ہوموز کی پریڈ میں شامل ہو کر فخر محسوس کرتا ہے تو لعنت ہے اس کی عقل و فہم پر۔۔۔

اس کے منہ سے F، ورڈ پھسلتے رہ جاتا!

اسے یقین تھا کہ ایک روز جہالت کم علمی و کم فہمی کے تمام نظریات اسی طرح چیلنج ہو جائیں

گے۔ جیسے Intelligent Design کی تھیوری نے Darwinism کا Black Box کھول کر رکھ دیا ہے اور فیشن کے طور پر Atheist کہلانے والوں کا غرور بھی خاک میں مل گیا ہے۔

یا پھر "بچہ کس کا ہے؟" کے Reality Shows میں تماشہ بننے اور بنانے والے، اپنے گھروں میں مریم کی تصویریں لگا کر چھوڑ دیں گے۔

☆☆☆

جینی ذہین تھی مگر ابھی وہ سیکھ رہی تھی۔ عاقل کی ایک Facebook والی Friend اسے عربی قاعدہ پڑھایا کرتی تھی۔ اسلام کی طرف اس کی پیش قدم اس کی ایک مسلمان فرینڈ کی وجہ سے ہوئی تھی اور جلد ہی اس نے ایک مقامی مسجد میں جا کر اسلام قبول کر لیا تھا۔

Jennifer عرف، جینی بھی والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس معاشرے میں رہتے ہوئے اس کی فیملی کی ترجیحات بھی اوروں کی طرح تھیں اور دوسروں کی طرح اسے بھی اخلاقی اور مذہبی قدروں کی گڈمڈ ہو جانے سے پیدا ہونے والے Challenges کا سامنا تھا۔ مگر اس کے سوچنے کا انداز بھی اس کے والد کی طرح Straight Forward تھا۔ وہ بھی Double Standards کے قائل نہ تھے۔ جینی کی والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے ہی جینی کی دیکھ بھال کی تھی اور دوسری شادی نہ کر کے انہوں نے جینی کا اعتماد ابھی تک توڑا نہیں تھا۔ انہیں جینی کے اسلام قبول کرنے پر بھی اعتراض نہ ہوا۔

مائی فرینڈ! ویسے میں مذہب کو زیادہ سمجھتا نہیں ہوں۔ اگر دنیا میں مذہب سے کوئی فرق پڑا ہوتا تو کم از کم یہ Hypocrisy تو نہ ہوتی۔

بھئی لوگ Pork نہیں کھاتے، مگر شراب تو پیتے ہیں نہ، کیونکہ ایک مذہب میں شراب ممنوع ہے ناں!" انہوں نے اپنا کاؤبوائے ہیٹ سر سے اتار کر عاقل کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے" میں جانتا ہوں Dude۔۔۔ اگر قانون نہ ہو تو بچے بھی کھلم کھلا شراب پینے لگیں کہ میرے مذہب کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا حالانکہ سبھی جانتے ہیں Pork بھی مضر صحت ہے اور شراب بھی!!Funny Ya" "یہ جینی بھی تو پہلے۔

"Well! I Don't Know

"میرا مطلب ہے کیا مذہب تبدیل کرنے سے جنت میں داخلہ کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔؟" عاقل خاموشی سے ستار ہا اور ہاتھوں میں پکڑا Cowboy ہیٹ گھماتا رہا۔

"اگر جنت چاہیے تو ہمیں اپنی زندگیوں میں خدا کو آنے دینا ہوگا!"

یکدم ہیٹ کے ساتھ ساتھ عاقل کی گھومتی ہوئی عقل بھی، پرسکون ہوگئی۔ کم از کم Atheist تو نہیں تھے جینی کے والد! اور اس نے ہیٹ اُنہیں واپس پہنا دیا۔

پھر عاقل، جینی سے ملتا رہا کیونکہ اسے جینی سے مل کر اور اس سے باتیں کر کے سکون ملتا تھا۔۔۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔ وہ اپنی زندگی کی مشکلات میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر ایک روز جینی نے خود ہی اسے Propose کر دیا۔ عاقل نے گھبرا کر جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ جینی نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ ذہین تھی۔ کبھی کبھی Chat کرنے کی کوشش ضرور کرتی مگر عاقل جواب نہ دیتا۔

"نہ جا۔۔۔ نہ جا!" اس کے کانوں میں یہ الفاظ گونجتے رہتے۔

☆☆☆

رات ابھی باقی تھی باہر گاڑیوں کی آمد و رفت کا شور جوں کا توں تھا۔ عاقل کی عقل Middle "C" پر نکی ہوئی تھی۔ Right اور Left ہینڈ کے سبھی Notes خلط ملط ہو رہے تھے۔ مگر اسے جینی سے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔۔۔ "جینی میں تم سے۔۔۔" "نہ جا۔۔۔ نہ جا۔۔۔"۔۔۔

اس نے Hoodie پہنی، کھڑکی کھولی اور نہ چاہتے ہوئے کمپیوٹر، آن کر کے بیٹھ گیا جینی نے ابھی ابھی کوئی Link Send کیا تھا۔ کیا وہ بھی اس وقت جاگ رہی تھی۔۔۔! اس نے Icon کو Click کیا۔ You tube پر نہایت روح پرور تلاوت کی صدا گونجنے لگی۔ موسیقی حرام کیسے ہو سکتی ہے۔ 'Taboo' ورنہ خدا اپنا کلام گنگنانے سے ضرور روک دیتا۔ "لا" Stop۔۔۔ خدا کو آنے دو۔۔۔ اپنی زندگی میں۔۔۔ جینی کے والد کے الفاظ گونجے۔۔۔

اس کی بے چینی کو سکون ملنے لگا۔ زندگی میں سکون کا احساس ہی جنت ہے۔ کیا جینی۔۔۔ اس کی جنت!

شاید بند گلی میں سے کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔ کوئی نہ کوئی کھڑکی ضرور کھلے گی۔۔۔!!!

خواب

نا جانے کب سے باچھواس درخت کی شاخوں پر، پوری ہوشیاری سے اپنے وجود کو سنبھالے بیٹھا تھا، جو چاروں اطراف سے پانی سے گھرا ہوا تھا۔ سیلابی پانی نے پوری بستی کو ڈبو رکھا تھا۔ لگتا تھا، دور دور تک دکھائی دینے والے سارے درخت، پینٹ برشوں کی طرح، مٹیالے پانی کے بڑے سے ٹب میں الٹے کھڑے ہیں۔ ڈوبتے سورج کی اداس، ملگجی شعاعوں میں، درختوں کے ابھرتے ہوئے آدھے ادھورے سر، کسی انجان مخلوق کی طرح پراسرار اور بھیانک دکھائی دے رہے تھے۔ بستی کی زمین کسی نامانوس سیارے کی غیر آباد سطح کی طرح ویران نظر آتی تھی۔

باچھو کی دھندلائی نظر اب بھی پانی پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ خاموش نگاہوں سے اس سامان اور مخلوق کو تک رہا تھا جو ابھی ابھی، سیلاب کے تازہ ترین ریلے میں بہتی چلی آ رہی تھی۔ سیلابی ریلہ تھا کہ ناکام عاشق کے نالے کی طرح رکنے میں نہیں آ رہا تھا، ریلے کے شور میں تمام آہ و بکاہ دب چکے تھے اور آس پاس سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

باچھو کے کپڑے اب بھی بھیگے ہوئے تھے۔ وہ اس لمحہ مٹیالے رنگ کے کسی پتلے کی مانند دکھ رہا تھا، جسے کمہار نے کچھ دیر پہلے ہی بنایا ہو اور سکھانے کے لیے درخت کی شاخوں پر اٹکا دیا ہو۔ مگر جسے سوکھنے سے پہلے بارش کی بوندوں نے پھر سے بھگو دیا ہو۔ باچھو کا پورا وجود ایسی ہی بدقسمتی سے تر تھا۔

درخت کی ایک شاخ پر باچھو کا بستہ بھی لٹکا ہوا تھا جس میں چند روز پرانی، باسی روٹی کے چند ٹکڑے، کچھ بھیگی ہوئی کاپیاں، کتابیں اور ایک پلاسٹک کا کھلونا، اب بھی موجود تھے۔ باچھو کا بستہ اوپر سے گیلا گیلا لیکن اندر سے کہیں کہیں، سوکھا سوکھا تھا۔۔۔اس کی بچی کھچی خوش قسمتی کی طرح!

باچھو کا دھیان جب کبھی بھی اس ناگہانی آفت کے نظاروں سے ہٹتا، وہ بے اختیار ادھر ادھر تکنے لگتا۔ جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ مگر پھر اچانک، کوئی بہتی ہوئی چیز اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی

اور وہ اپنی نظریں سیلاب کے پانی پر جمالیتا۔

باچھو کا معصوم مگر ذہانت سے روشن ذہن بجھا بجھا تھا۔ وہ اُس سرد مہری سے گزرتی لاش کو دیکھتا، جس بے اعتنائی سے بہتی ہوئی چار پائی کو جس پر لیٹ لیٹ کر زندہ آدمی، عمر کا نا جانے کتنا حصہ بے خبری کی حالت میں گزار دیتا ہے اور کبھی سوتے ہوئے اور کبھی جاگ کر، پورے، ادھورے خواب دیکھتا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی وہ تڑپ اٹھتا۔ اسے لگتا کہ پانی میں بہتا ہوا جھنجھنا بھی اس طرح اپنی جان بچانے کی فکر میں ہے جیسے خود روتا، بلبلاتا، بے بس بچہ!

باچھو اتنا مُن ہو چکا تھا کہ اسے اپنے وجود کا بھی احساس نہیں تھا۔ اس حالت میں وہ غم اور خوف میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بس اتنا پتہ تھا کہ اسے کسی نہ کسی طرح درخت کی شاخوں میں اڑے رہنا ہے۔ کب تک؟ یہ سوال اتنا مشکل تھا کہ ماسٹر جی، پوری کوشش کے باوجود بھی اس کا جواب نہ دے پاتے۔

ماسٹر جی! جو لکڑی کی ایک بدنما چھڑی، موٹے عدسوں کی ایک عدد خستہ حال عینک اور اپنی پرانی، بوسیدہ پگڑی کی بدولت، سکول کے ماسٹر بنے بیٹھے تھے۔ سکول! جو ایک بڑے سے اکھڑے پھکوے تختہ سیاہ اور ٹاٹ کے چند کٹے پھٹے ٹکڑوں کی بناء پر سکول کہلاتا تھا۔

ویسے بھی "علم نگر" کہلائی جانے والی اس چھوٹی سی بستی میں، جسے بلدیاتی الیکشنوں کے دنوں میں یہ "نام" عطا کیا گیا تھا، زیادہ سکولوں اور استادوں کی ضرورت ہی کہاں تھی۔ چھوٹے چھوٹے معمولی ذریعہ معاش رکھنے والے بستی کے بے بس باشندے دن بھر اپنے بچوں کے لیے دو وقت روٹی کی خاطر، اَن تھک محنت کے بعد جب رات کو بغیر بستروں کی چار پائیوں پر لیٹتے تو انہیں اتنی گہری نیند آ جاتی کہ "بڑا" بننے کے خواب دیکھنے کا ہوش بھی نہ رہتا۔ جوان یا بوڑھے، سبھی جانتے تھے کہ انہیں اپنے اپنے جدی پشتی پیشے، اپنے اپنے بچوں کو منتقل کر دینے کے بعد، ایک روز لمبی تان کر سو جانا ہے۔ بے شمار سکولوں اور بڑے بڑے آدمیوں سے بھرے ہوئے اتنے بڑے ملک میں یہی چھوٹی سی بستی ان کا اور ان کے بچوں کا ماضی بھی تھی اور مستقبل بھی!

☆☆☆

"ماسٹر جی! خواب کیا ہوتے ہیں؟"

ایک دن باچھو نے کتاب میں سوٹ بوٹ والے آدمی کی تصویر دیکھ کر ماسٹر جی سے سوال کر

ڈالا۔ جو نا جانے کیوں ہمیشہ ہی سوالوں سے گھبرا جایا کرتے تھے۔

''خواب!!'' ماسٹر جی، گویا نیند میں بڑبڑائے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جماعت کے بچوں کو ''پڑھائی'' پر لگا دینے کا فرض انجام دے لینے کے بعد، خوابیدہ سے ہو کر ڈھیلی ٹانگ والی کرسی پر، ملک کے نظام کی طرح ادھر اُدھر ڈول رہے تھے، جھٹ، پگڑی اور عینک سنبھالتے ہوئے، ہوش میں آ گئے۔

''خواب! ارے بھئی۔۔۔ کون دیکھ رہا ہے خواب؟'' انہوں نے اپنی عینک کو آنکھوں سے چپکا لیا تا کہ وہ کھلی رہیں۔ سب بچے مسکرانے لگے۔ ماسٹر جی نے بوکھلا کر زمین پر پڑی چھڑی اٹھانی چاہی تو ان کی پگڑی، منہ کے بل زمین پر جا پڑی۔ اب تو سب بچے کھلکھلا اٹھے۔

''کون ہنسا!!'' ماسٹر جی نے پگڑی جما کر اور چھڑی گھما کر ''رعب جمایا''۔ سب بچوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

''کوئی نہیں! ماسٹر جی!۔ یہ تو باچھو پوچھ رہا تھا کہ خواب کیا ہوتے ہیں؟'' کہیں پیچھے سے کامو کی آواز آئی۔ ماسٹر جی کامو کو ہمیشہ پیچھے بٹھا دیا کرتے تھے کیونکہ اُسے بات بے بات لقمہ دینے کی عادت تھی اور ماسٹر جی کو اپنے ''حکومتی دور'' میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہ تھی۔

''ہائیں! یہ کیسا سوال ہے باچھو!'' وہ باچھو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ماسٹر جی کبھی بچوں کو اصل نام سے مخاطب نہ کرتے۔ ایک تو اس بے جا تکلف سے ان کی زبان لڑکھڑا جاتی۔ دوسرا خوامخواہ ہی بچوں کو عزت دے کر سر چڑھانا نہیں چاہتے تھے۔

ابے خواب، تو بس نیند میں تنگ کرنے کو آتے ہیں!'' ماسٹر جی نے اپنی پگڑی پر مٹی کے ساتھ ساتھ، ''فلاسفی'' جھاڑنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی انہیں اپنا تازہ ترین خواب یاد آ گیا۔ جس میں وہ کرسی کی لڑکھڑائی ٹانگ ٹوٹ جانے کے باعث زمین پر گر گئے تھے۔ ماسٹر جی کو نا جانے کیوں لگا کہ جیسے خواب پورا ہونے والا ہو۔ وہ یکدم کھڑے ہو گئے کہ اگر ایسا ہوا تو بچوں کہ ہنسنے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔

اگر چہ دنیا میں بچے کی کھلکھلاہٹ سے خوبصورت کوئی دوسری شے نہیں۔ مگر ماسٹر جی کو بچوں کی ہنسی سے چڑ تھی۔ بچپن سے بڑھاپے تک تمام عمر ہی زندگی ان پر کھلکھلا کر ہنستی رہی اور وہ روتے رہے تھے۔ ان کے پاس تھا ہی کیا۔ ڈھیلی کرسی جیسی، لنگڑی لولی تعلیم، جس پر کئی سالوں سے وہ جم

کر بیٹھے رہنے کی کوشش میں تھے۔ تعلیم! جو خود بھی ایک ہی جگہ جم کر رہ گئی تھی اور جس سے آراستہ ہونے کے بعد آج تک کوئی بچہ، ماسٹر بھی تو نہ بن پایا تھا!

''ماسٹر جی! خواب سچے ہوتے ہیں یا جھوٹے!'' باچھو نے سوال موڑنے کی کوشش کی۔

''ماسٹر جی! خواب دیکھنا اچھا ہے یا برا۔'' اور کامو نے سوال مروڑنے کی۔۔۔

''خواب۔۔۔خواب۔۔۔خواب!!!''

ماسٹر جی غصے میں پھنکارنے لگے۔ اب ماسٹر جی بے چارے، فرائیڈ تھوڑا ہی تھے کہ خواب کی تعریف کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے۔ نہ ہی وہ کوئی قومی لیڈر تھے جو خواب دیکھ کر ایک نیا پاکستان کھڑا کر دیتے۔

''ابے، یہ دن دہاڑے تم کن خوابوں کی باتیں کر رہے ہو۔ نامعقولو!

تمہیں پتہ ہے۔ دن میں خواب دیکھنے اور دکھانے والوں کو بیوقوف کہتے ہیں۔ بے وقوف!''

اور ماسٹر جی، جواب کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈر رہے تھے، خوامخواہ کلاس کا راؤنڈ لینے نکل پڑے۔ انہیں لگا شاید اس اثناء میں ان کی کرسی خود بخود ہی ان کی حکومت کی طرح مضبوط ہو جائے گی۔

''اب اگر کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میرے غصے سے کوئی بچ نہ پائے گا'' ماسٹر جی نے پالیسی میں تبدیلی کر دی۔

''ماسٹر جی۔ غصہ کیا ہوتا ہے!'' کامو زیرِ لب ممنایا اور ماسٹر جی کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا جو، گندی پگڑی سر پر دھر لینے کی وجہ سے سر میں پڑی مٹی کے باعث، سر کھجا رہے تھے۔

☆☆☆

ویسے کچھ سمجھ میں نہ آئے تو سر کھجا لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ بشیر عرف باچھو کا کوئی سوال سن کر، نذیر عرف جیرو کمہار، جب اپنے مٹی والے ہاتھوں سے سر کھجانا شروع کرتا تو گیلی مٹی اس کے بالوں میں چپک جاتی اور باچھو مسکرانے لگتا۔ تب بھی اس کی خشک کھوپڑی کو کوئی جواب نہ سوجھتا تو وہ گھبرا کر ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے لگتا اور اس کا ماتھا بھی مٹی سے لبڑ جاتا، جو اس کا نصیب تھی۔ تب بیٹے کو دیکھ کر باپ کی باچھیں کھل کھل جاتیں۔ باچھو کی کھلکھلاہٹ سے جیرو کمہار کے ہاتھوں کے بنے مٹی کے سارے برتن بھی مسکرانے لگتے۔

باچھو ہمیشہ ہی سکول سے واپسی پر باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ وہ تازہ گیلے برتنوں کو آنگن کے

ایک کونے میں ترتیب دیتے دیتے سوچتا کہ ایک روز جب ان کی زندگیاں بھی ترتیب پا جائیں گی۔ وہ اپنے باپ کے سر اور ماتھے سے مٹی پونچھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ بظاہر مسکرا دینے والے باچھو کے ننھے سے دل میں ہزاروں آنسو چھپے رہتے جو شام گئے تک دھوپ کی کرنوں میں چمکتے رہتے اور پھر کسی نہ کسی طرح برتنوں کی طرح خشک ہو جاتے۔

آنگن کے دوسرے کونے میں ایک پیڑ تلے بچھی چارپائی پر ماں صغیر عرف صاگو کو بٹھا کر شکر کا شربت بنانے چلی جاتی۔ ماں کا نام کیا تھا۔ آج تک باچھو نے یہ سوال نہیں کیا تھا۔ شاید ماں کو نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ صرف ماں ہوتی ہے۔ ہر حال میں ماں!

اس دوران صاگو، اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے، چارپائی پر پڑے باچھو کے بستے کی تلاشی لیتا رہتا۔ پھر ایک ایک کر کے وہ بستے کی سب چیزیں نکال کر چارپائی سے نیچے پھینکتا جاتا اور تالی بجا بجا کر خوش ہوتا رہا۔ اگرچہ ہر بچہ بچپن میں ہی تالی بجانا سیکھ جاتا ہے۔ مگر تمام عمر وہ تالی بجانے کا مطلب جان نہیں پاتا۔ جب بستہ خالی ہو جاتا تو وہ اردگرد سے چھوٹے موٹے کھلونے اٹھا کر بستے میں بھرنے لگتا۔ ماں لوٹ کر صاگو کی کارستانی پر اسے ایک چپت رسید کر دیتی اور وہ منہ بسور لیتا۔ تب باچھو، صاگو کو منانے کے لیے اپنے شربت کے گلاس سے صاگو کو شربت پلانے لگا اور کہتا "فکر مت کر صاگو۔ ایک دن تیرے پاس بھی ایسا ہی بستہ ہوگا۔" تب صاگو خوش ہو کر تالی بجاتا اور درخت پر بیٹھے سارے پرندے چہچہانے لگتے۔

☆☆☆

شام ڈھلے پرندوں کی چہچہاہٹ شروع ہو گئی تھی۔ وہ خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ وہ سارا دن اپنے بچوں کے لیے دانہ پانی کی تلاش میں محنت کر کے لوٹے تھے۔ باچھو کو یاد آیا کہ کئی روز سے اس نے پانی نہیں پیا تھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ مٹی کے شربت جیسا پانی مگر پانی کے اس صحرا میں باچھو کی پیاس بجھ چکی تھی۔ اتنے روز پیاسا رہنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔

کئی روز بھوکا رہنے کا تجربہ اسے ہو چکا تھا، جب بستی میں فصلی کیڑوں کو مارنے والی ناقص دوا کے استعمال کے بعد فصلیں اجڑ گئی تھیں اور بستی میں قحط پڑ گیا تھا۔ تب کئی کئی روز بستی والوں کے گھروں میں چولہے نہیں جلے تھے۔ ان دنوں باچھو کے پیٹ سے کچھ روز تک ایسی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ جیسے صاگو مٹی کی گڑوی میں اپنے کینچے ڈال کر ہلا رہا ہو۔ پھر وہ آوازیں خود بخود ہی

ایسے غائب ہو گئیں تھیں جیسے بے بس عوام کا احتجاج حکومت کی بے حسی کے آگے دم توڑ دیتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے بستی میں اناج کی بوریاں بھجوائیں، جن میں مٹی ملی ہوئی تھی۔ تب بھوکے لوگ، بھوک کے بجائے، کھا کر، پیٹ کی بیماریوں سے مرنے لگے تھے۔

چاروں طرف پھیلے ہوئے مٹیالے پانی کے صحرا میں بھی آب تھا نہ کوئی سراب!

ویسے تو کبھی کبھی آدھے، پونے روزے رکھ کر بھی باچھو بھوکا پیاسا رہ لیا کرتا تھا۔

مگر اس قربانی میں خوشی ملتی تھی اور پھر شام کو ماں کے ہاتھ کے مزے مزے کے پکوان کھا کر، اگلے روز وہ پھر بھوکا پیاسا رہنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ اگلے روز وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش ہوتا۔ خوشی کو سمجھنا، غم کو سمجھنے کی طرح آسان نہیں ہوتا!

ویسے سب سے زیادہ خوشی اسے گھر والوں کے ساتھ سے ہوتی۔ ماں، بابا اور صا گو بس یہی تھی اس کی کل کائنات! ان سب کو خوش دیکھنا اور خوشی دینا بس اتنا ہی سا تھا اس کا خواب! اسے یاد تھا کہ ماسٹر جی نے اگر کوئی بات غصہ ہوئے بغیر سمجھائی تھی تو وہ یہ تھی کہ ماں باپ پر پیار کی نظر ڈالنے سے بھی ثواب حاصل ہوتا ہے۔ ثواب! اور کسی سوال کا جواب چھڑی اٹھائے بغیر دیا تھا تو یہی کہ 'ثواب جیسے اچھے نمبر' اور باچھو کو بہت سے اچھے نمبر اکٹھا کرنا تھے۔ "ماسٹر جی اچھے نمبر لے کر کیا ملتا ہے؟" تب بھی کامو نے دخل اندازی کی تھی۔ "کامیابی ملتی ہے۔۔۔ جو اس کامو کے بچے کو تو ملنے والی نہیں" اور ماسٹر جی نے کوسنے کی شکل میں گویا پیش گوئی ہی فرما دی تھی۔ ویسے اکثر اساتذہ چڑ کر نجومی بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ناکامیوں کا غصہ اپنے طالب علموں پر نکال کر اطمینان حاصل کر لیتے ہیں۔

کامو کا اصل نام تو کمال تھا مگر وہ ماسٹر جی کے کوسنوں کی وجہ سے کبھی کوئی کمال نہ دکھا پایا تھا۔ کامو کو خود بھی یقین تھا کہ وہ بھی اپنے ابا کی طرح موچی کا موچی ہی رہ جائے گا اور ایک دن شاید ماسٹر جی کے جوتے سیئے گا جو کبھی کبھی اس کے سر بھی پڑ جایا کرتے تھے۔ لگتا تھا اس میکنے سے ماسٹر جی کی جدی پشتی دشمنی تھی جسے نکالنے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیا کرتے تھے۔ ندی کا پانی میینے کی کم عقلی سے "گدلا" ہوتا یا ماسٹر جی کے غصے سے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

"غصہ کیا ہوتا ہے؟" "ماں! باچھو کے فلاسفری سر نے، ماں کی بغل سے باہر جھانکا۔ ماں جو

صبا کو کی چھوٹی سی چارپائی پر سلانے کے بعد، باچھو کو لگاتار سوچتے دماغ کو سہلانے اور سلانے، باچھو کے پاس چلی آتی تھی، باتوں کے موڈ میں نہیں تھی۔ پھر بھی وہ باچھو کا سوال ٹالنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ باچھو سوال کے بارے میں سوچتا رہے گا۔

یہ بچے اتنے سوال کیوں پوچھتے ہیں؟ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ کیا واقعی ہر سوال کا جواب ہوتا ہے؟ اس نے باچھو کی طرف دیکھا جو ایک ٹک آسمان کے اندھیروں کو گھور رہا تھا۔ جیسے اس انتظار میں ہو کر اماوس کی کالی رات میں بھی کہیں نہ کہیں سے چاند نکل آئے گا۔ یہ بچے اتنے پرامید کیوں ہوتے ہیں آخر!

''غصہ۔۔۔ غصہ آندھی جیسا ہوتا ہے باچھو۔۔۔ طوفان جیسا زلزلے جیسا۔۔۔'' اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔

''تو کیا غصے سے آندھی آتی ہے۔۔۔ طوفان۔۔۔ زلزلہ۔۔۔''

''شاید! اللہ میاں کے غصے سے تو ایسا ہی ہوتا ہے باچھو!''

''لیکن اللہ میاں کو غصہ کیوں آتا ہے ماں؟ وہ تو ہمیں ماں باپ سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے ناں۔ بابا نے تو یہی بتایا تھا، ایک دن۔''

''ہاں اس لیے کہ تمہارا باپ کبھی غصہ نہیں کرتا۔ وہ صرف صبر کرتا ہے۔''

لیکن اللہ میاں غصہ میں آ جاتا ہے جب انسان، دوسرے انسان کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کا حق مارتے ہیں۔''

''حق کیا ہوتا ہے ماں!''

باچھو کی نیند اڑ چکی تھی اور اس کی سوچ کی اڑان کی ہمسفر بن کر آسمان کی وسعتوں میں بھٹکنے لگی تھی جہاں بہت سے لاجواب سوال جل بجھ رہے تھے۔

ماں بھی کچھ اُلجھ گئی۔ پھر اس نے باچھو کا سر سہلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اچھا یہ بتا باچھو، کہ تیرے بستے میں کیا کیا ہوتا ہے؟''

''کاپیاں، کتابیں، قلم۔۔۔ اور میٹھی میٹھی روٹی۔۔۔'' باچھو نے پیار سے ماں کے ہاتھ کو چوم لیا۔

''ہوں! بس حق بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو بھی تجھے چاہیے وہ تجھے ملے۔ اچھی تعلیم، کھانا، پہننا ۔۔۔ یہ سب جو تیرے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں لکھا ہے، ترے اختیار میں ہو اور تیری پیاری

پیاری آنکھوں میں جتنے خواب ہیں سب پورے ہو جائیں۔"

"ماں! ماسٹر جی کہتے ہیں خواب دیکھنے والے بیوقوف ہوتے ہیں۔"

"بیٹا وہ تو اصل میں غریب ہوتے ہیں جن کے پاس خواب بھی نہیں ہوتے۔"

"غریب؟" (باچھو کسی امیر آدمی کو نہیں جانتا تھا)

"جیسے مٹی کے خالی برتن!"

آج باچھو کو لگا غصہ "سیلاب" ہوتا ہے، جس میں سوتے، جاگتے، سبھی خواب مٹی کے کچے پکے برتنوں کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ جس میں ماسٹر جی کا سارا غصہ اور سارے سوال، کامو اور اس کے ابا کی دکان کے، ٹوٹے جوتوں کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ جس میں صاگو اور صاگو کے رنگ برنگے کھلونے اس کے بے بس بچپن کی طرح بہہ جاتے ہیں۔۔۔ جس میں ماں۔۔۔

ماں۔۔۔ اسے ماں یاد آنے لگی۔۔۔ ماں۔۔۔ بابا۔۔۔ صاگو۔۔۔ وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا۔ مگر اس کے سب آنسو اس کے خشک گلے میں پھنس کر رہ گئے تھے اور اندر ہی اندر کہیں بہہ گئے!

☆☆☆

بدنصیبی کی سیاہ کالی گھناؤنی رات کے حصار میں، چاروں طرف گدلے پانی کا صحرا تھا اور باچھو کئی روز سے بھوکا پیاسا، اپنے بستے سمیت درخت کی شاخوں میں اٹکا ہوا تھا۔ آخر کار برسات کا آخری دن، مایوسی کی اس رات کے اندھیروں بھری گود میں بے بسی کی نیند سونے لگا۔ مگر باچھو گزشتہ کئی راتوں کی طرح اب بھی شاخ پر بیٹھے اُلو کی طرح بجھی آنکھیں کھولے جاگ رہا تھا۔

دوسری بستیوں کی طرح اس بستی میں سیلاب تو آتے ہی رہتے تھے۔ مگر اس سال کی طغیانی، ناگہانی اور بے رحم تھی۔ کچھ وجہ تو ناقص بند ٹوٹ جانے کی تھی، جس پر تحقیق کرنے کے لیے ہنگامی طور پر تشکیل دی گئی حکومتی کمیٹی اپنی کارروائیوں میں مشغول تھی۔ ایک سیاسی طبقہ، ہمیشہ کی طرح تباہی کی تمام ذمہ داری ہمسایہ ملک پر تھوپ کر اپنی نا اہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں تھا۔

اگر چہ "علم نگر" کی تباہی کی داستان، جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ مگر ابھی تک سیلاب زدگان کی مدد کے لیے کوئی باقاعدہ کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ اگر چند مقامی، فلاحی تنظیمیں اپنی مدد آپ کے تحت گرد و نواح کے علاقوں سے گنتی کی چند جانیں بچا پائی تھیں لیکن سیلابی ریلوں کی غیر متوقع اور ناگہانی آمد نے، جو ہر کسی کی سمجھ سے باہر تھی، یہ کام بھی مشکل کر دیا تھا۔

بہت سے رضا کاروں کے پاس آفت زدہ علاقوں تک پہنچنے کے لئے وسائل موجود نہ تھے اور باقی سب دعاؤں اور وظیفوں سے کام چلانے کی کوشش میں تھے۔

پھر اچانک ہی جگہ جگہ پلاسٹک کے لمبے لمبے برساتی بوٹوں والے نمودار ہونے لگے اور سیلاب کے پانی میں ٹانگیں ڈبو ڈبو کر تصویریں اتروا تے رہے تا کہ دنیا بھر سے ہمدردی اور امداد کی اپیل کر سکیں۔ پھر آسمان پر چند ہیلی کاپٹروں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں اور کچھ لوگوں کی نشاندہی پر بالآخر شاخوں پر اڑے ہوئے مٹیالے پتلے کو "ریسکیو" کر لیا گیا۔

☆☆☆

سیلاب زدگان کے ایک کیمپ میں چھوٹے بڑے بچے خالی ہاتھوں اور خالی آنکھوں سے اپنا تماشہ بنانے والوں کو گھور رہے تھے، جو مختلف ٹی وی چینلوں پر ان کی "لائیو" نشریات دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔

ایک کونے میں باچھو، ہاتھوں میں بستہ دبوچے بیٹھا تھا۔ مٹی سے اکڑے ہوئے بستے میں اب بھی باچھو کی کتابیں، کاپیاں۔۔۔ ماں کے ہاتھ کی بنی میٹھی روٹی کے چند ٹکڑے اور صاگو کا ایک کھلونا، کسی گذشتہ جنم کی نشانیوں کی طرح پڑے تھے۔

ڈاکٹروں کی ٹیم نے سب بچوں کا طبی معائنہ کرنے کے بعد، باچھو کے لیے خاص ہدایات جاری کی تھیں کہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے کھانے، پینے کے لیے دیا جائے، ورنہ اس کی بچی کھچی جان کو مزید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

میڈیا والے بچوں سے طرح طرح سوال کر کر کے انہیں حراساں کرنے کی کوشش میں تھے۔ ہر کوئی اس کوشش میں تھا کہ آفت زدہ مخلوق کی کسم پرسی کا اشتہار بنا کر زیادہ سے زیادہ شہرت کما سکے۔ باچھو اگرچہ ان سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں بول رہا تھا۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ باچھو اس کے سوال کا جواب دے دے۔ آخر ایک ہوشیار خاتون صحافی نے آگے بڑھ کر باچھو کے بستے کو چھوتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا اس بستے میں کیا ہے؟"۔۔۔ اچانک جیسے باچھو کو ہوش آ گیا۔۔۔ پھر ایک دل سوز چیخ کی آواز سنائی دی "سیلاب!"

نا جانے کب تک باچھو کو دوسرے بچوں کے ساتھ کیمپ میں مقیم رہنا پڑا۔ پھر لاوارث بچوں کو ایک ایک کر کے مختلف پناہ گاہوں میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں ہر ایک کے لیے زندگی کا ایک نیا

جنم، نئے امتحان لیے منتظر تھا۔

آخر کار، باچھو کو اس کے بستے سمیت ایک دینی مدرسے میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں کچے ذہنوں پر سفید ٹوپیاں چڑھا کر، انہیں دینی عالم بنانے کی کوشش میں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا جاتا تھا اور آخرت میں کامیابی کی گارنٹی کے بدلے میں زندگی کے سارے خوابوں کا سودا کر لیا جاتا تھا۔

اب بھی ''علم نگر'' باچھو کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ مگر وہاں سوال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ باچھو کے پاس کوئی سوال تھا، نہ وہ سوال کر سکتا تھا۔ اس روز سوال کا جواب دینے کے بعد، باچھو کی آواز ہمیشہ کے لیے خالی برتنوں جیسے خلاؤں میں گم ہو گئی تھی۔ وہ بس لکھ لکھ کر سبق یاد کرتا اور امتحان دیتا رہتا۔ اس کی زندگی ایک روبوٹ کی طرح میکانی اور بے حس ہو چکی تھی۔ وہ چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوتا جاگتا روبوٹ تھا۔ مگر کبھی کبھی وہ نیند نہ آنے کی وجہ سے رات رات بھر اُلوؤں کی طرح ایک کونے میں بھوکا پیاسا جاگتا رہتا اور صبح کاپی میں ایک ہی لفظ بار بار لکھ کر تالی بجاتا رہتا۔ ''سیلاب''

جس روز ایسا ہوتا۔ ملک کی کوئی نہ کوئی بستی کسی ناگہانی آفت سے گھر جاتی!

پانی

ندی کا پانی صاف تھا یا نہیں، یہ تو کوئی نہیں جانتا، لیکن ندی کی رواں سطح سے منعکس ہونے والی چاند کی دودھیا کرنوں کی روشنی میں ایسا لگ رہا تھا جیسے پانی نہیں، ''چاندی'' بہہ رہی ہو۔ ندی کے ساتھ ساتھ لہروں کی دھیمی لے پر، دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی چاندی کی پائیل بھی ہلکے ہلکے سر بکھیر رہی تھی۔ درختوں کے پراسرار شانوں پر دھرا گول چاند، چاندی کے گھونگھٹ کے اندر چھپا ہوا اضطراب پڑھنے کی کوشش میں تھا۔ کبھی کبھی چاند کی پُراشتیاق کرنیں چاندی کے ٹھنڈے گالوں سے ٹکرا جاتیں۔ جن پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد تازہ آنسو سچے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ چاندی کی پائیل کے سُر کبھی کبھی خاموش دعاؤں کی بجائے بلند التجاؤں میں تبدیل ہو جاتے اور وہ ڈر کر اپنی چال اور بھی دھیمی کر لیتی۔

آج رات اسے پیپل کے اس پیڑ تک ہی تو پہنچنا تھا جہاں کچھ عرصہ سے وہ دن کے کسی پہر، اپنے محبوب سے ملنے آیا کرتی تھی۔ تب وہ اپنے گرد لپٹتی ہوئی دھوپ کی تمازت میں خود کو محفوظ تصور کیا کرتی تھی۔ آج چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں بار بار اس کا نازک وجود خوف کی جھرجھری لے رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے پیڑوں کی شاخوں کے تاریک سائے، اسے اپنی آسیبی بازوؤں میں دبوچ لیں گے۔ اس کے منتظر دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں جن میں فقط محبوب کے ملن کی امید ہوا کرتی ہے۔ مگر اس لمحے محبت کے دشمنوں کے خوف نے اس مختصر سے سفر کو طویل ترین کر رکھا تھا۔ ایسے دشمن جو آنکھوں سے اوجھل رہنے والی بلاؤں کی طرح ہمیشہ نظروں سے اوجھل مگر موجود رہتے ہیں اور سب کرماتی کلمات کا ہالہ توڑ کر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

عظیم چوہدری کے گھر کے درودیوار پر تاریک ماتم چھا گیا تھا جب سے اس نے سنولائی رنگت

والی نومولود بچی کو دیکھتے ہی غصے سے منہ پھیر لیا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ اس کے خاندان میں کی، کمینوں والا رنگ شامل ہو جاتا۔ دائی، جو کئی پشتوں سے چودھریوں کی خدمت پر مامور تھی، بلا توقف بول اٹھی۔

”لگتا ہے لڑکی پر کسی نحوست کا سایہ ہے۔“

شوہر اور دائی کے منفی رویوں کے باوجود ذکیہ نے بڑھ کر بچی کو سینے سے لگا لیا تھا جو بے نیاز نگاہوں سے کمرے کے خلا کو گھور رہی تھی۔ بچی کی آنکھیں چاندی کے بٹنوں کی طرح چمکدار تھیں۔ اسی لمحے ماں نے بچی کا نام ”چاندی“ رکھ لیا تھا۔

چاندی، ذکیہ کی پہلی اولاد تھی۔ اس سے پہلے چودھری کے دو بیٹے پہلی بیوی سے تھے، جو کسی نامعلوم وجہ سے نفسیاتی مریض بن چکی تھی اور شہر کے پاگل خانے میں زیر علاج تھی۔ ذکیہ کا تعلق پاس والے گاؤں سے تھا، جو کچھ عرصہ قبل کسی عورت کی پراسرار گمشدگی کے باعث خبروں کی زینت بنا رہا تھا۔ عورت کی رنگت گہری سانولی تھی۔ کچھ لوگ اسے ”پہنچی ہوئی“ اور کچھ ”جادوگرنی“ خیال کرتے تھے۔ کیونکہ حالات کی ماری ہوئی وہ عورت، لمبے عرصہ سے بالکل تنہا تھی اور لوگوں کے رحم وکرم پر زندہ تھی۔ وہ اکثر خاموش رہتی، کبھی کبھی اس کے منہ سے عجیب باتیں سننے کو ملتیں جن میں سے بیشتر کسی کو سمجھ نہ آتیں اور جو سمجھ آ جاتیں وہ پوری ہو جاتیں۔ لوگ اس سے ہمدردی بھی جتاتے اور کتراتے بھی کہ کہیں کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

ذکیہ کبھی اس عورت سے مل نہ پائی اور پھر ایک روز اس کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں پتہ چلا، جب وہ بیاہ کر اس گاؤں میں آ چکی تھی۔ ذکیہ عمر میں چودھری عظیم سے کافی چھوٹی تھی اور پہلے ہی کچھ سہمی سہمی رہا کرتی تھی۔ مگر چاندی کی پیدائش کے بعد چودھری کا رویہ ذکیہ سے بدل رہا تھا۔ آخر ایک روز اس نے پراسرار طور پر چاندی کو دائی کی مدد سے کسی دور کے علاقے میں منتقل کروا دیا جہاں وہ ایک بیوہ عورت کے پاس پلنے لگی۔ بیوہ عورت، گاؤں کے کمہار سے پیالے خرید کر ان پر بیل بوٹے بناتی اور پاس کے شہر میں بیچ کر گزر بسر کرتی تھی۔

☆☆☆

نظروں سے دور کرنے کے باوجود، چودھری کی نظر چاندی پر رہتی اور وقتاً فوقتاً، دائی کی مدد سے چاندی کی خبر لیتا رہتا۔ اس سے یہ سمجھ لینا قطعی غلط فہمی تھی کہ اس کے سینے میں بھی باپ کا دل تھا جو کبھی کبھی اولاد کے لیے دھڑک لیتا تھا۔ دراصل وہ چاندی کی خبر اس طرح رکھتا جیسے کوئی اپنے دشمن

کی نقل وحمل کی خبر رکھتا ہے۔ پتہ نہیں اندر ہی اندر اسے کیسا خوف لاحق تھا جو خود اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ شاید یہ خوف، کوئی گلٹ تھا جو ہر ظالم کے دل میں موجود رہتا ہے اور اسے انجانے اندیشوں میں مبتلا رکھتا ہے۔

☆☆☆

لڑکیوں کو جوان ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے اور حسن کی تعریف کو رنگت تک محدود کر دینا، اس لفظ کے معنی سے زیادتی کرنے کے مترادف ہوگا۔ چاندی کا حسن اس کے چہرے کی رنگت نہیں بلکہ اس پر چھایا ہوا نور تھا۔ جو اس کی پرکشش شخصیت کا عکاس تھا، جو تہہ در تہہ اس کی ذات کے اندر چھپی ہوئی تھی مگر بلا جھجک اس کی آنکھوں سے عیاں ہو جاتی تھی۔ وہ جس سے مل لیتی وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ یہ سحر ان دعاؤں سے بنا ہوا وہ ہالہ تھا جو ماں کے دردمند دل سے آہوں کی طرح نکلتی رہتی تھیں۔ وہ ماں جو اولاد سے جدائی کے دکھ میں رو رو کر بیچ بیچ اپنی بینائی کھو بیٹھی تھی۔ مگر آج بھی جسے یقین تھا کہ ایک روز ضرور اس کی بے نور آنکھیں اپنی چاندی کو محسوس کر کے ٹھنڈی ہو سکیں گی۔

اس ہالے میں بیوہ عورت کے منہ سے نکلنے والے ان کرامتی کلمات کا اثر بھی تھا جو وہ بڑے خلوص سے چاندی پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتی تھی اور جنہیں یاد کر کر کے چاندی نے اپنے دل و دماغ کو روشن کر لیا تھا۔ ان کلمات میں قرآن کی وہ آیات بھی تھیں جو وہ مٹی کے پیالوں پر بیل بوٹوں کی شکل میں لکھا کرتی تھی اور یہ ہنر بھی اس کی پہچان بننے لگا تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے ذرا دور کھیتوں سے آگے کھلے میدان میں ہر سال کی طرح ثقافتی میلہ لگا ہوا تھا۔ اس سال دور دراز کے گاؤں سے، مراد شاہ بھی اپنے چند دوستوں کے ہمراہ، میلے سے لطف اندوز ہونے آ پہنچا تھا۔ ویسے بھی مراد شاہ کو گھومنے گھمانے کے علاوہ کوئی اور کام ہی کہاں تھا۔ اسے کھیتی باڑی میں کم اور آوارگی میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ سب سے چھوٹا تھا اور سب سے زیادہ لاڈلا بھی رسمی طور پر کھیتوں میں باپ کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا لینے کے بعد وہ غائب ہو جاتا۔ کاندھے پر کپڑے کا تھیلا لٹکائے، ہاتھ میں چھڑی گھماتا وہ کہیں کا کہیں نکل جاتا۔ اکثر اس کے اپنے سنگی ساتھیوں کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں ہے۔ کبھی کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا چلا جاتا اور وہیں کہیں تھک کر سو رہتا۔ کبھی کسی درخت کے نیچے رانجھے کی طرح بانسری بجاتا اور کبھی ندی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی

میں غوطے لگاتا۔ کوئی کہتا اس پر آسیب ہے اور کوئی چھیڑتا عاشق! مگر اسے تو عشق و محبت کی داستانوں میں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب کبھی بسبیل تذکرہ، ان کا ذکر ہوتا وہ بے نیازی سے سنتا رہتا یا اپنی بانسری بجانا شروع کر دیتا۔ سامنے سے چاہے بکری گزر جاتی یا گاؤں کی کوئی خوبصورت مٹیار، اس کے لیے دونوں ایک برابر تھے۔

محفلوں میں دوست جانے کیسے کیسے مشروب اڑا جاتے۔ مگر وہ صرف پانی پیتا رہتا۔ اسے پانی پینے کا شوق تھا۔ پیاس لگے نہ لگے، جہاں پانی دیکھتا ایک آدھ گھونٹ تبرک سمجھ کر چڑھا جاتا۔ کبھی تھیلے میں پانی کی بوتل نہ رکھتا۔ اسے کنوئیں سے نکال کر، ہاتھ کے نلکے سے گھڑ کر یا ٹیوب ویل میں منہ ڈال کر پانی پینے میں مزا آتا تھا۔ "کتنا پانی پیئے گا یار!" اس کے دوست اس پر ہنستے رہتے۔ "بس اتنا کہ پیاس باقی رہے۔" اور ایسی بات ہمیشہ اس کے دوستوں کے سروں پر گزر جایا کرتی وہ سب اسے "سائیں" مراد کہنے لگے تھے۔

☆☆☆

میلہ دیکھتے دیکھتے بھی وہ یار بیلیوں سے، دانستہ یا نادانستہ بچھڑ چکا تھا۔ کھٹے میٹھے مشروبات سے بھرے میلے میں سادہ پانی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ اس حصے میں پہنچ گیا جہاں میلے کے رنگ پھیکے پڑنے لگے تھے۔ وہیں ایک پیڑ کے قریب ہاتھ کا نلکا لگا نظر آیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی مگر نلکے میں سے قطرہ قطرہ پانی بڑی مشکل سے نکل پا رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر گھمائی۔ پاس ہی ایک مٹی کا خوشنما پیالہ نظر آیا جو پیالے سمیٹتی چاندی کی گٹھری میں سے لڑھک کر نا جانے کیسے اتنی دور آ پڑا تھا۔ مراد شاہ نے بلا تامل پیالہ اٹھایا اور ہینڈل چلا چلا کر، پیالے میں پانی اکٹھا کرنے لگا۔

"پہلے پیسے چکاؤ پھر استعمال کرنا۔"

زندگی میں پہلی بار کسی مترنم نسوانی آواز کو مراد شاہ نے ایسے رعب جھاڑتے ہوئے سنا۔

"یہ پیالہ بھی میرا ہے۔" چاندی کی گٹھری میں اس جیسا ایک اور پیالہ نکال کر مراد شاہ کو دکھایا۔

"اکڑتی کیوں ہے۔ ذرا شکل دیکھ اپنی!" مراد شاہ نے چڑتے ہوئے جواب دیا اور جیب سے چند پیسے نکال کر چاندی کی گٹھری کے پاس پھینک دیے۔

چاندنی نے ایک لمحے کو مراد شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اپنی گٹھری اٹھا کر

خاموشی سے چل دی۔اس نے پیسوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

کچھ دیر مرادشاہ وہیں کھڑا رہا۔دوسرے لمحے نہ پانی رہا،نہ پیاس اور وہ پیالہ ہاتھ میں تھامے،چاندی کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

اس دن کے بعد وہ کئی بار اس راستے پر چلتے چلتے چاندی کے گھر کے پاس پہنچ جاتا اور گھر سے کچھ دور پیڑوں کی اوٹ میں چھپا رہتا۔پتہ نہیں کون سی کشش تھی جو اسے کھینچ کر وہاں پہنچادیتی۔

کئی روز گزر گئے۔ایک روز چاندی کی نظر مرادشاہ پر پڑی اور جیسے اس کے وجود پر کوئی بجلی کوندگئی پھر برسات شروع ہوئی اور بھیگتے بھیگتے وہ خود بھی پانی کی ندی بن گئی۔پھر یہ ندی بہہ کر سمندر سے ملنے نکل پڑی۔

مرادشاہ آگے آگے چل رہا تھا اور پیچھے پیچھے تھی چاندی۔سچ ہے عشق اندھا ہوتا،شاید گونگا بھی۔۔۔بہرا بھی! کب کیوں۔۔۔کیسے ہوجاتا کوئی نہیں جانتا۔

مرادشاہ گاؤں سے دور پیپل کے ایک پیڑ تلے بیٹھ گیا اور بانسری بجانے لگا۔چاندی بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور خاموشی سے اس کی بانسری سنتی رہی۔پاس ہی ندیا کا پانی،بانسری کے سروں کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔

☆☆☆

کچھ عرصہ اندھے،گونگے اور بہرے عشق کی داستان یونہی چلتی رہی۔ایک روز جب مرادشاہ کے دوستوں کو اس داستانِ عشق کی خبر ہوئی۔انہوں نے مرادشاہ کو روکنا چاہا۔لاکھ چھپا کر بھی یہ بات اندر ہی گردش کرنے لگی تھی کہ چاندی ایک منحوس لڑکی ہے۔مگر مرادشاہ کو کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔اس کا پیار اگرچہ ندی کے بہاؤ کی طرح غیرارادی اور سیدھا سادھا تھا مگر سمندروں سے زیادہ گہرا تھا۔چاندی کے دل کو بھی کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔

ایک روز سیاروں کی طرح گھومتے رہنے والے مرادشاہ کو تحفہ دینے کا خیال آیا تو اسے چاندی کے پیر ہی یاد آئے۔جو بے اختیار اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تھے۔وہ اس کے لیے چاندی کی پائیل خرید کر لے آیا اور پاؤں میں پہنا کر بولا۔

''چاندی! کیا تم زندگی بھر میرے ساتھ چلوگی؟''

ہمسفر بنانے کی خواہش کا اظہار کرنے کا یہ انوکھا طریقہ سونے کے دل والی چاندی کو اتنا بھایا

کہ ایک روز وہ اس کے ساتھ بھاگنے کو بھی تیار ہوگئی۔
ہوا یوں کہ کسی نہ کسی طرح عظیم چودھری کے کانوں سے بھی عشق کی بانسری کے سر جا ٹکرائے۔
اور اس کے کالے دل نے پھر ایک بھیانک سازش بننا شروع کردی۔ جو تمام عمر یہی کام کرتا رہا تھا۔
مراد شاہ پہلے ہی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی نہیں اور اسے کسی نہ کسی طرح چاندی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرنا ہی ہوگا۔

☆☆☆

چاندی ندی کی لہروں کے ساتھ چلتی چلتی، آخرکار پیپل کے اس پیڑ تک جا پہنچی تھی جہاں اس کی محبوب نے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس کا وجود عشق کی سچائی سے سرشار تھا۔ جسے چاند کی پاکیزہ کرنوں نے دمکایا ہوا تھا۔ اس نے کوئی سنگھار نہیں کیا تھا۔ مگر وہ کسی دلہن کی طرح دمک رہی تھی۔
اس کے ہاتھ خالی تھے اور پیر محبت کی نشانی کے زیور سے سجے ہوئے تھے۔
وہ پُرامید نگاہوں سے آنے والے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ مگر آنے والے کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ آئے تو عظیم چودھری کے بھیجے ہوئے کتے جو شکار کا خون سونگھتے ہوئے اپنی وفاداری نبھانے پر مامور کیے گئے تھے۔
پھر کیا ہوا یہ کسی کو معلوم نہ ہو پایا!
پھر کچھ عرصہ میں پراسرار عشق کی یہ وہ ادھوری بخارات کی طرح فضا میں تحلیل ہوگئی۔

☆☆☆

ندی کا پانی جوں کا توں بہتا رہا۔ پانی کا کام ہی بہنا ہے۔ لیکن کیا کبھی کوئی مان سکتا ہے کہ پانی کا ایک فن، کہنا بھی ہے۔ کیا کبھی کوئی جان سکتا ہے کہ پانی کے ننھے منے قطرے سنتے بھی ہیں اور محسوس بھی کرتے ہیں۔ پانی سے بنے یہ ننھے منے پیام بر، جم کر جب مختلف انداز سے کرسٹلز میں تبدیل ہو جاتے ہیں تو دراصل کہانیاں رقم کر رہے ہوتے ہیں۔ ارتعاش اور گونج کی زبان میں ریکارڈ ہو جانے والی یہ کہانیاں صرف واقعات ہی نہیں بلکہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے محرکات بھی ہوتی ہیں مگر دنیا کی اکثریت تو صمٌ بکمٌ امیٌ ہوتی ہے۔ ایسے ہی ڈاکٹر Jay تھے جو اپنے ہم عصر جاپانی ڈاکٹر ایموٹو کی کسی تحقیق سے متفق ہونے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی منطق کے مطابق ایسے تمام تر نظریات جن سے Damacration کا مسئلہ کھڑا ہو جائے غیر منطقی اور بے معنی تھے۔

انہیں تو پہلے ہی الفاظ کی طاقت پر مبنی Kotodama جیسے لغو خیالات میں دلچسپی نہ تھی، کجا کہ وہ یہ تسلیم کر لیتے کہ زیرِ لب دعائیں اور دل میں چھپی نیتیں بھی اثر رکھتی ہیں اور یہ کہ پانی صرف زندگی کی بقا کا ضامن ہی نہیں بلکہ "علاج" بھی ہو سکتا ہے۔

ایسا ہی کوئی کرشمہ اس پیالے کے پانی میں تھا جو ہر وقت سائیں بابا کے ہاتھوں میں لٹکا رہتا تھا۔
کچھ عرصہ پہلے پتہ نہیں کیا ہوا کہ ندی کا بہتا ہوا پانی کچھ لوگوں کے لیے آگ بن گیا، کسی کی پیاس بجھاتا تو کسی کی بھڑکا دیتا۔ کسی کے ہونٹ جل اٹھتے تو کسی کا بدن اور پھر ایسا تاپ چڑھتا کہ جان پر بن جاتی۔ کوئی معالج بھی علاج کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ پانی کا برا اثر انہی پر ہوتا ہے جن کے دل کالے ہیں۔ کیونکہ اس پانی نے کبھی کسی بچے کو متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ پانی عجیب تھا کبھی پاک کرتا اور کبھی ناپاکی عیاں کر دیتا جو بد نیتی اور شک کی پیداوار ہوتی ہے۔

☆☆☆

اس واقعہ کو کئی برس گزر چکے تھے۔ ابھی عشق کے بخارات فضا میں معلق تھے کہ ایک روز ایک اندھا فقیر چلتے چلتے ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ اس کا بدن مٹی سے اٹا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا، جو کافی بوسیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کافی عرصہ سے کسی نے اُس پیالے میں پانی نہیں ڈالا تھا۔ ڈالتا بھی کون.... اور کیوں.... فقیر کو پیاس ہی نہیں لگتی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی کتنی دیر پانی پیئے بغیر گزارہ کرتا رہتا۔ دراصل جب تک کوئی اسے روٹی اور پانی نہ دیتا، وہ بھوکا اور پیاسا ہی رہتا۔ اسی وجہ سے اس کا جسم اکثر کسی انجانی حرارت سے گرم رہتا، جیسے اسے بخار ہو۔
جب ندی کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے اندھا فقیر پیپل کے اسی پیڑ کے پاس پہنچ گیا جہاں کئی برس پہلے چاندی کو پہنچنا تھا۔ اچانک اس کے پیروں سے کوئی چیز ٹکرائی۔ پتہ نہیں کیوں اس نے جھک کر سوکھے پتوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ جلد ہی اس کے ہاتھوں سے چاندی کی ایک پرانی پائل ٹکرا گئی جو آب و ہوا کے اثر سے سنولا چکی تھی۔ فقیر کی آنکھوں میں نور باقی نہیں تھا مگر اس کا دل روشن تھا۔
اس نیم مردہ وجود میں جان باقی نہیں تھی، مگر انگلیوں کا لمس ابھی زندہ تھا۔ ایسا ہوتے ہی عشق کی کوئی پراسرار، ادھوری کہانی جو بہت عرصہ پہلے بخارات کی طرح فضا میں تحلیل ہو گئی تھی، اچانک بادلوں کی طرح آسمان پر چھانے لگی۔ پھر بادلوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپکنے لگا اور اندھے

فقیر کے بوسیدہ وجود میں جذب ہونے لگا۔

اندھے فقیر کا وجود جو خشک مٹی کا صحرا بن چکا تھا، پھیل کر سمندر بننے لگا جس نے آسمان سے اترنے والی ندی کو اپنے اندر سمو لیا۔ اس نے وہ پائل اپنے پیر پہ باندھ لی اور بے ساختہ رقص کرنے لگا۔ اس کے رقص نے فضا میں ٹوٹی ہوئی بانسری کے سر بکھیر دیے جواب بھی اس کے کاندھے پر لٹکے تھیلے میں موجود تھی۔

وہ رقص کرتا رہا، کرتا رہا۔۔۔اور نا جانے کس لمحے تھک کر گرا اور سو گیا۔ مگر پتہ نہیں اس رات کون کون سی ماورائی طاقتیں گہری نیندوں سے جاگ اٹھیں۔

یہی تو وہ مقام تھا جہاں کئی برس پہلے اس کی چاندی کو موت کی نیند سلا دیا گیا اور اس کے مردہ جسم کو بہتی ندی کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس لمحے نہ جانے وہ کہاں تھا۔۔۔! اُسے ہوش آیا تو ایک کمرے میں بند تھا، کھلی کھڑکی کے باوجود، جہاں گھپ اندھیرا تھا۔

ادھر اُدھر ٹٹولنے پر اسے ایک تھیلا ملا جس میں مٹی کا ایک پیالہ اور ٹوٹی ہوئی بانسری تھی۔ اس کی آنکھوں اور سر میں شدید درد تھا، لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا اور اسے کہاں جانا تھا؟

☆☆☆

اگلی صبح، جب اندھا فقیر بیدار ہوا تو اسے شدید پیاس لگی تھی۔ اس نے مٹی کا پیالہ اٹھایا اور نیچے اتر کر ندی کا پانی بھر لیا۔ پھر گھونٹ گھونٹ پیتا رہا۔ پانی پینے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی پیاس جاگ اٹھی ہو۔ وہ پانی پیتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے جسم کی ساری تپش پانی نے جذب کر لی اور وہ برسات سے بھیگی مٹی کی طرح ٹھنڈا اور پر سکون ہو گیا۔

اسی لمحے پیالے کا پانی، پانی نہیں "دوا" بن گیا۔

مگر دوا کا اثر اب بھی پر اسرار تھا۔ کسی کے لیے شفا اور کسی کے لیے قضا، کیونکہ پتہ نہیں کیوں مگر کچھ لوگوں کی بیماری پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا اور سائیں مراد کے پیالے سے لگی ہوئی ان کی مراد پوری نہ ہو پاتی۔

اُس پانی نے ایک طرف چاندی کی ماں کی بینائی لوٹائی تو دوسری طرف عظیم چوہدری کو کسی پُراسرار بیماری، جو کوڑھ سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی، میں مبتلا کر دیا اور آخر کار، تڑپا تڑپا کر اُس کی

جان لے لی۔

ہوتے ہوتے ندی کے پانی کی خبر، جاپان تک جا پہنچی۔ ڈاکٹر ایموٹو کے شاگرد طرح طرح کے پانیوں کے نمونوں کا تقابلی جائزہ لیتے رہے تھے۔ ہر پانی میں بننے والی کرسٹلز کی اپنی خاصیت اور انفرادیت تھی مگر تمام کی تمام ہشت پہلو ہی تھیں۔ زم زم کے پانی کی کرسٹلز، اس پانی کی تاثیر کی گہرائی کی طرح تہہ در تہہ تھیں۔ کچھ پراسرار پانیوں کی کرسٹلز جن پر ماورائی اثر کا شائبہ تھا۔ ہفت پہلو تھیں اور کافی حد تک بگڑی ہوئی تھیں۔

ندی کے پانی کی بیشتر کرسٹلز دل نما تھیں۔ کچھ بنی ہوئی کچھ بگڑی بگڑی۔ لیکن ڈاکٹر Jay کے زیر مطالعہ اکثر کرسٹلز کے عین وسط میں، پراسرار سیاہ دھبے تھے!!

انکشک

زمین کی بے کنار وسعتوں تک پھیلی ہوئی برف کی چادر پر ایک چٹیل چٹان کی طرح دکھائی دیتا ہوا، چھوٹے بڑے پتھروں کا ڈھیر، انکشک، لائبریری کی عمارت کے باہر ایسے کھڑا تھا، جیسے کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ انکشک کے پورے وجود پر گذشتہ رات کے برفانی طوفان کی باقیات آڑھی ترچھی لکیروں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ کئی صدیوں سے ہر جانے انجانے کے انتظار میں وہیں کھڑے کھڑے اس کے پیر سوج چکے تھے مگر چہرے پر تھکاوٹ کی کوئی لکیر نہ تھی۔ نہ زبان، ہمیشہ کی طرح خاموشی سے پتھرائی ہوئی تھی مگر کبھی کبھی یوں لگتا جیسے ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔
عبدالقیوم نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ انکشک پر ڈالی اور ایک سوالیہ نشان اس کے ذہن کے پردے پر ابھرا اور ڈوب گیا۔ اس وقت تو وہ خود بھی پتھرایا ہوا تھا اور اپنی پتھرائی ہوئی سوچ میں ایک اور پتھر کا اضافہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر یہ انکشک منزل کا نشان تھا تو اس سے زیادہ اسے کیا درکار ہو سکتا تھا۔ پتہ نہیں کیسے کیسے جتن کر کے، کن کن پڑاؤں سے گزرتا ہوا، بالآخر وہ اپنی منزل پر پہنچ رہا تھا۔ پہنچتے پہنچتے، انکشک کے پتلے کے جسم کی طرح اس کے بھی ٹکڑے ہو چکے تھے۔ یہ پتہ نہیں چل رہا تھا سر کی جگہ، دھڑ ہے یا دھڑ کی جگہ سر، لگتا تھا سوجے پیروں کی طرح بھاری پتھر اوپر اور پتھرایا ہوا بھاری دماغ نیچے آ گیا ہو۔

☆☆☆

امریکہ سے کینیڈا کے سفر کے بعد بھی پتہ نہیں کن کن کارروائیوں سے گزر کر اسے ملک کا Refugee Status حاصل کرنا تھا اور پھر Permanent Resident یا Citizen کا۔ سفر کرتے کرتے اس کی عمر کی تیسری دہائی، اپنے اخیر کو جا پہنچی تھی۔ مگر ابھی تک اس کی زندگی کا سر پیر واضح نہیں ہو سکا تھا۔
آخر اسے کیا چاہیے تھا! یہ ابھی تک طے نہیں کر پایا تھا۔ اسے وطن سے محبت تھی۔ مگر اتنی بھی

نہیں کہ وطن کے دیئے ہوئے زخموں کو سہلاتا بھی رہے اور وطن پرستی کے گن بھی گاتا رہے۔ وہی وطن جہاں ہم وطن زخموں کے بھرنے کی بجائے، انہیں کریدنے کی فکر میں ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کا تماشہ بنا کر لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ وہ وطن میں پیدا ضرور ہوا تھا، مگر یہ محض اتفاق تھا۔ وطن میں تڑپ تڑپ کر جان دے دینا، اس کا مقدر نہیں ہو سکتا۔ سماجی ناانصافی اور لاقانونیت کی آلودہ فضا میں سانس لیتے لیتے، وہ کب تک جی سکتا تھا۔ جس میں بظاہر دکھائی نہ دینے والے ایسے جراثیم تھے جنہوں نے روحوں کو بھی Slow Poisoning کا شکار کر رکھا تھا۔ جہاں ایک طبقہ دو وقت کی روٹی کے لیے جان ہلکان کر رہا تھا اور دوسرا ہاتھ میں موبائل فون پکڑے Status دکھانے کی فکر میں تھا۔

ہر طرف پھیلے ہوئے انتشار کو ترتیب دینے کی کوئی ترکیب بھی تو نہ تھی۔ سب نظام کو دوش دیتے مگر نظام کو بدلنے کا حوصلہ بھی کسی میں نہیں تھا۔

ذہین تھا مگر، وسائل کی کمی کے باعث، اسے کوئی موقع نہ مل سکا کہ وہ کوئی مقام حاصل کر پاتا۔ Sports میں جانا چاہا تو سفارش نہ ملی۔ سائنس میں جھنڈا گاڑنا چاہا مگر Couching نہ ہونے کے باعث اپنی نیا ڈبو لی۔ اب وہ VIP تو نہیں تھا کہ Seat مل جاتی۔ ایک راستہ تھا "مقابلے کا امتحان" اسے بھی وہ شارٹ کٹ سمجھ کر آزما چکا تو اس نے چور دروازوں کی تلاش شروع کر دی اور پھر ایک روز ایسے ہی کسی چور دروازے میں داخل ہو کر وہ دوبئی پہنچ گیا تھا۔ ابا کا غصہ، ماں کے کوسنے، بہن بھائیوں کی دہائی، سبھی پیچھے چھوٹ گئے تھے اور وہ اکیلا بہت دور نکل آیا تھا۔ پھر سفر در سفر کرتے وہ پہلے سعودی عرب، اٹلی اور لندن سے ہوتا ہوا امریکہ پہنچ گیا اور اب وہ کینیڈا کی حدود میں تھا۔ دنیا کے بہترین ملک میں! جس نے اس جیسے نہ جانے کتنے پناہ گزینوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

اب تک اسے ہر ملک سے کوئی نہ کوئی شکایت تھی کہیں زبان سے، کہیں رویوں سے۔ غیر اسلامی ممالک میں عدم اسلام اور اسلامی ممالک کے اسلام سے اور اسی ذاتی کشمکش اور اختلاف کے سرد گرم اتار چڑھاؤ کے لمبے پاٹ کو عبور کرتا ہوا وہ بالآخر دنیا کے منجمد علاقے میں آ پہنچا تھا۔ جہاں بظاہر ہر زبان، رویے اور مذہب کو اس کی اصل حالت میں قبول کرنے اور قائم رکھنے کے

مواقع موجود تھے۔

جلد ہی اس کی ملاقات کچھ اور پناہ گزینوں سے ہوئی جو اپنے Refugee Status کو تحفظ دینے کی جدوجہد میں جتلا تھے۔ اگرچہ Refugee اور Landed کی شناخت، الگ الگ آئی ڈی کارڈوں کے ذریعے کی جاتی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے دونوں، ایک ہی قسم کے "گلٹ" میں جتلا ہوں۔ کیا شناخت میں تفریق کرنے والے کارڈ بھی ان کے گلٹ کی تفریق کر سکتے تھے۔ کیونکہ دونوں ہی تو تارکِ وطن تھے۔ ہجرت کرنے والے بھی، بھاگ جانے والے ہی تو تھے۔

ملک کے حالات سے ملک والوں سے یا اپنے آپ سے! دونوں ہی اس ایک سوال کے آگے خاموش کھڑے تھے۔

کیا مذہب اور سیاست کے نام پر کی جانے والی ہجرت آج کل بھی وہی اہمیت اور حیثیت رکھتی ہیں جو تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں؟ کیا مہاجر کبھی وہی مقام حاصل کر پاتا ہے جو اس زمین کے اپنے باشندوں کو حاصل ہوتا ہے؟ کیا زمین مہاجر کو اسی طرح قبول کرتی ہے جس طرح مہاجر زمین کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے؟

اسے ورک پرمٹ ملا تو کوئی جاب پسند نہیں آئی۔ آخر اتنی دور وہ مزدوری تلاش کرنے تو نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اسے Hair Cutting یا Sewing کا کورس کر کے نائی یا درزی بننا تھا۔ اردو میڈیم سکول میں پڑھتے رہنے کے بعد انگریزی کے ذریعے، Up-Grade کرنے میں بھی اسے دلچسپی نہ تھی۔ بچوں کو پارک میں کھیلتا دیکھ کر سوچتا کہ گھر ہی بسا لے۔ Convenient Marriage سے اس کے Status کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا تھا مگر وہ خود کو اتنا گرانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے یاد آیا کہ کیسے اس کا ہم وطن ہمسایہ، صبح صبح نشے کی حالت میں کسی سفید فام عورت سے گذشتہ رات کا حساب وصول کرنے کے لیے سرِعام اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش میں تھا۔ یہ وطن چھوڑتے ہی لوگ مادر پدر آزاد کیسے ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

فیملی! کتنا خوبصورت رشتہ تھا اور اسے اپنی بچھڑی ہوئی فیملی یاد آنے لگی۔

☆☆☆

سامنے پارک میں سات، آٹھ برس کا ایک بچہ پتھر پر پتھر دھرتا جا رہا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟ Bro!" اس نے اپنا دھیان بٹانے کی خاطر بچے کو مخاطب کرتے

ہوئے پوچھا۔

''انکلفک'' بچے نے جواب دیا۔

''انکلفک؟''

''پتھروں کا آدمی''

نا جانے کیوں اسے لگا جیسے اس کا جسم پتھرانے لگا ہو۔

''کیوں؟'' اس نے بچے سے پوچھا۔

''نہیں، یونہی'' ''Just like that'' یہ دکھا رہا ہے کہ یہاں شکار کی جگہ ہے۔'' بچے نے جواب دیا۔

''مگر مجھے تو کوئی شکار دکھائی نہیں دے رہا۔ انسانوں کا شکار؟۔۔۔ کیا یہ مطلب ہے تمہارا۔''

اور اسے لگا جیسے وہ خود اپنے ہی شکار میں پھنس گیا ہے''So Dumb'' بچے نے بلا تامل تبصرہ کر دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ اتنے میں سامنے بیٹھی عورت جو جسامت سے حاملہ دکھائی دے رہی تھی، چلا اٹھی ''ہائے اللہ!'' ابھی ابھی اسے ایک چھوٹا سا پتھر آ لگا تھا۔ جو محلے کے Bullies کے Gang کی لیڈر لڑکی Alex نے اس کی طرف اچھالا تھا۔

وہ عورت اکثر شام کو اپنے دو تین سال کے بچے کو Stroller میں بٹھا کر پارک میں لایا کرتی اور اس سفید فام بگڑی ہوئی بچی Alex کو جب بھی موقع ملتا، وہ اسے اپنے ماتحت بچوں کی مدد سے تنگ کرتی۔ عورت کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ دوسرا وہ کچھ خائف سی رہتی کہ کہیں یہ بدمعاش بچے اس کے بچے کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ عورت کی بے چارگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے Alex اور اس کے Gang کے دوسرے بچے شور مچانے لگتے''Go Away'',''Go Away''۔

آج بھی وہ خاموشی سے اپنے بچے کو Stroller میں بٹھا کر پارک سے باہر چلی گئی۔ سب بچوں نے Alex کو Hi Five دیا اور پھر پارک کے دوسرے بچوں سے پنگے لینے لگے۔ ایک بچے نے پتھروں کے آدمی کو ٹھوکریں مار مار کر گرا دیا۔

عبدل کا جی چاہا کہ Police کو Call کرے اور اس Harrasment کی اطلاع دے۔ مگر وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا اور Alex کو Smile دیتا ہوا پارک سے نکل گیا۔ شاید جہاں Discriminahion With Smile ہوتی ہے۔ وہاں Compromise بھی

ان کے اونگھنے کی آواز سنائی دیتی۔ بچے جان بوجھ کر شور نہ مچاتے کہ اگر وہ جاگ گئیں تو ہسٹری پڑھنی پڑے گی۔ عبدل کو لگا کہ پوری تاریخ بھی ان کے ساتھ ساتھ اونگھنے لگی تھی۔ ٹیچر کے رویے کی وجہ سے نہ تو کبھی تاریخ اس کے پلے پڑی اور نہ کبھی اس کے نمبر ہی آ سکے اور وہ تاریخ کے اوراق سے گزرے بغیر ہی مستقبل میں آ پہنچا تھا۔ ویسے تاریخ میں تھا بھی کیا! جھگڑے! بس؟ نہیں کچھ تہذیب اور ادب بھی تھا شائد، جسے تیاگ دینا سب سے آسان تھا۔ تبھی تو شاید انگریزی نہ جاننے والے بھی اپنے بچوں سے انگریزی ہی بول رہے تھے اور اس بات پر انہیں فخر بھی تھا۔ حالانکہ سکول بورڈ والے گھر پر مادری زبان کے استعمال کی ترغیب دے رہے تھے اور چند مقدمات پر اردو کی کلاسوں کا انتظام بھی موجود تھا۔ اس سلسلے میں انگریزی زبان کے ٹی والوں نے بھی بچوں سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کر رکھی تھی۔ کیا ہمارے لوگوں نے بھی کبھی اپنی ذمہ داری سمجھنے کی کوشش کی؟

ادھر Alex بھی اپنے Gang کے ساتھ آ پہنچی۔ وہ بھی اپنے آپ کو شاید ملکہ سکندر یہ سمجھ بیٹھی تھی۔ پہلے اس نے عورت کو منہ سے تنگ کرنا شروع کیا۔ پھر اس نے Ignore کیا تو وہ اپنی حرکتوں پر اتر آئی۔ اس دفعہ عورت نے ہمت کی اور اس کی بانہہ پکڑ لی۔ Alex چلانے لگی۔

"She Touched' Me"۔"She Touched' Me!"

اور یہاں Touch کرنے کا مطلب لفظ سے بہت زیادہ ہے۔ یہ سوچ کر عبدل نے جلدی سے اٹھ کر ایک عورت کو مشورہ دیا: "باجی آپ یہاں سے چلی جائیں"

'Alex'Go Away""Go Away" چلانے لگی۔

"This is Our land"

"You F`....Immigrants" اور اس نے روایتی گالی نکال دی۔

"Go away" Gang کے دوسرے بچے بھی چلانے لگے۔

اتنے میں Steve کے دادا نے Steve کے کان میں کچھ کہا اور Steve بھاگ کر Alex کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس نے بڑی نرمی سے Alex سے پوچھا۔

If this is Your Land Where' re Your Stories?

یہ وہ جواب تھا جو دادا کے دادا نے کئی برس پہلے ان کی زمینوں میں گھسے چلے آنے والے Invaders کو دیا تھا۔ ظاہری بات تھی یہ بات موٹی دماغ کی Alex کے پلے نہ پڑی اور وہ

چلی گئی۔

☆☆☆

Stories....!

کہانیاں! وہ ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا۔ کیا کہانیاں اتنی بڑی دلیل تھیں جو آپ کو کسی جگہ کا اصل حق دار بنا دیں۔ کم از کم Kanata سے Canada بن جانے والی اس نئی Settlement کے بیشتر قانون دان ابھی تک ان Oral Societies کو تاریخی لحاظ سے قبول کرنے کو تیار ہی نہیں جنھوں نے زبانی کلامی داستانوں کو علم، اختیار اور وقار کی سند سمجھ رکھا تھا۔ جو کہانیوں کو اپنی تہذیب اور روایات کی بقا خیال کرتے ہوئے یہ ذمہ داری نسل در نسل سونپ کر گنگا نہائے بیٹھے تھے۔ وہ نسل جو چلا چلا کر کہہ رہی ہے کہ ان کا کلچر ان سے چھن چکا ہے، چھین لیا گیا ہے اور وہ نئی اور پرانی تہذیب کی۔۔۔ چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں۔ مگر ان کی آوازیں بھی ان کے آباؤ اجداد کی آوازوں کی طرح خلا میں کھو گئی ہیں یا خودکشی کی موت مر چکی ہیں۔ مگر پرانی زمینوں کے نئے مالک حقوق اور آزادی کے چارٹر میں ان پہلے لوگوں کے لیے الگ سیکشن بنا دینے کے بعد اپنی ذمہ داریوں سے "مکت" ہو چکے ہیں۔

یہی حال اور مستقبل، اسی نام نہاد ملٹی کلچر معاشرے میں موجود دوسرے کلچرز کا بھی ہے، جن کی کہانیاں، انھی کی زبانوں میں رقم ہونے کے باوجود بھی اس زمین پر موجود نہیں ہیں اور آئندہ چند نسلوں تک ان کا وجود ان سے منسلک خاندانوں سے اٹھنے والا ہے۔ تو کیا Multi Culturisms کے نام پر یہ کوئی Inter Cultural Trade جیسی کوئی سازش تو نہیں! یہ نظام ہے یا خود ہم؟

عبدل نے سوچا کیا میرے بچے کبھی میری کہانیاں جان پائیں گے؟ کیا ان کے بچے میری زبان بول پائیں گے؟ کیا یہ زمین کبھی ہمیں اپنائے گی؟ کیا ہماری شناخت باقی رہ پائے گی؟ کیا وہ خود کو کبھی اپنی سمت تلاش کر پائے گا یا وہ بھی کسی خود فریبی میں مبتلا ہو کر، ایک روز کہیں "Missing" ہو جائے گا۔ عبدل سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کا ذہن پتھرانے لگا، سوچ منجمد ہونے لگی۔ اسے لگا وہ اپنی ہی ذات کے Igloo میں بند ہو چکا ہے اور اپنے Survival کی خاطر مرے ہوئے جانوروں کے تیل کی آگ تاپ رہا ہے۔ اس اگلو میں مقید Campfire میں اور بھی کئی عبدل بیٹھے ہیں۔ عبدالقیوم کی طرح سب اپنی اپنی بقا کی جنگ اپنے اپنے طریقے

سے لڑ رہے ہیں۔ ایک عبدل دوسرے کو عقاب کا پر پکڑاتا ہے۔ اپنی حکمت اور بصیرت دوسرے کو Pass on کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر پھر بھی شناخت کی بقا کی جنگ ختم نہیں ہوتی۔ اسے لگا ہے دنیا ایک بڑے قید خانے میں تبدیل ہو گئی۔ جس میں Freelands کے نام پر چھوٹے بڑے قید خانے ہیں اور ان سب قید خانوں میں فنا سے پہلے، بقا کی جنگیں لڑی جا رہی ہیں۔ کچھ لڑ رہے ہیں، کچھ تھک چکے ہیں، کچھ ہار گئے ہیں۔

وہ جان نہیں پا رہا کہ اپنی حالت پر ہنسے یا روئے۔

☆☆☆

آج، اس پہر عبدل جاگ اٹھا ہے۔ غفلت کی گہری نیند سے، خود فریبی کا نشہ اتر رہا ہے۔ نشہ اترنے سے اس کے سر میں شدید درد اٹھا ہے مگر شاید کسی شامان کے قول کے مطابق، تنہائی کی ریاضت سے ملے اس درد نے اس کی "انترآتما" کو جلا بخش دی ہے۔ وہ مقدس چکر سے گزر کر شفایاب ہو چکا ہے۔ نہیں نہیں۔ وہ ان انسانوں میں سے نہیں جنہیں خداؤں کے خدا نے بے حسی کی سزا دینے کے لیے سچ مچ کا پتھر بنا دیا ہے۔ وہ زندہ ہے اور اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو گیا ہے۔ اسے کچھ کرنا ہے۔ بڑا نہیں تو چھوٹا کام۔ اسے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ چاہے وہ ایک Penny کا ہو!

وہ پاس پڑے سٹول پر چڑھ کر کھڑا ہوتا ہے اور اونچے الفاظ میں خود سے عہد کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے بچوں سے اپنی زبان میں بات کرے گا۔ انہیں اپنی زبان، سکھائے گا، پڑھائے گا، اپنی کہانیاں سنائے گا۔ یہی نہیں وہ دوسرے ہم وطن بچوں کو بھی اپنے دیس کی کہانیاں، اپنی زبان میں۔۔۔! جیسا کہ Steve کے بوڑھے دادا نے کسی شامان کا کہا دوہرایا تھا کہ "ہمیں اپنی شناخت آگے منتقل کرنا ہوگی تا کہ ہم شفایاب ہو سکیں۔"

شفایابی ہی اصل کامیابی ہے۔

وہ آج ہی لائبریری جائے گا اور اس Mission کے لیے Volunteer کرے گا اور اگر لائبریری نے اس کی مدد نہ کی تو وہ لائبریری کے باہر کھڑا ہو جائے گا۔ بالکل ایک انکشک کی طرح۔۔۔ اور بچوں کا انتظار کرے گا!

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
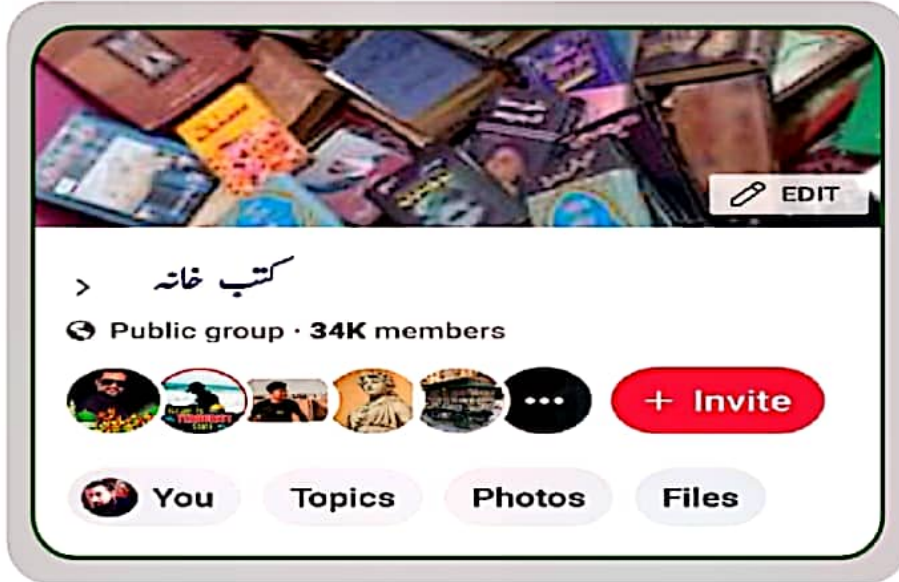
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

مٹی ابتدا بھی ہے، مٹی ہی فنا بھی!

مٹی میں ہی بقاء ہے، جستجو ہے، مٹی سے خواب بھی۔۔۔

مٹی کے خواب، جاگتی آنکھوں کے خواب ہوں یا سوتی آنکھوں کے۔۔۔

یہ خواب ادھورے ہوں یا پورے۔۔۔۔اس بات کا ثبوت ہیں کہ مٹی زندہ ہے۔

مٹی جس میں رنگ اگتے ہیں۔مٹی، جس میں خوشبو مہکتی ہے۔مٹی، جس میں آگہی جنم لیتی ہے۔مٹی، جس میں گیان پنپتا ہے۔

مٹی، جو جذبہ بھی ہے، جنون بھی۔احساس بھی، اظہار بھی!

کیونکہ، مٹی سنتی بھی ہے، کہتی بھی ہے۔۔۔

مٹی کے چپے چپے پر کہانیاں ہیں۔اس انتظار میں کہ کوئی آئے اور انھیں پڑھ لے۔

مٹی کے خواب بھی ایسی ہی ان کہی کہانیاں ہیں، جو مٹی نے کہیں اور آپ انھیں پڑھ رہے ہیں۔

فیکٹ پبلیکیشنز
Website: www.factpublications.com
Email: info@factpublications.com